کتاب نما کا خصوصی شمارہ

اختر سعید خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

اختر سعید خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتب

ڈاکٹر سید حامد حسین

ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اڈیٹر:۔ شاہد علی خاں

مہمان اڈیٹر:۔ ڈاکٹر سید حامد حسین

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

پہلی بار اگست ۹۳ء تعداد 500 قیمت =/51

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

فہرست

مہمان مدیر

ڈاکٹر سید حامد حسین

اشاریہ

اختر سعید خاں کی شاعری اور اس کا پس منظر و پیش منظر

جنوری ۱۹۴۹ء میں بھوپال میں منعقد ہونے والی ترقی پسند مصنفین کی تاریخی کانفرنس نے بھوپال کے جن شعراء کو شعوری طور پر متاثر کیا ان میں اختر سعید خاں کا نام سرفہرست ہے۔ اختر صاحب کو اس وقت شعر کہتے دس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور وہ شہر بھوپال کی شعری روایت کے ایک ایسے سلجھے بکھرے اور متوازن رجحان کی نمایندگی کرتے تھے جسے انھوں نے نہ صرف اپنے والد حامد سعید خاں سے ورثے میں پایا تھا بلکہ جس میں انھوں نے اپنے نوجوان تخیل اور عصری شعور کی مدد سے نئے گنجائشیں بھی پیدا کی تھیں۔

بھوپال میں اردو شاعری کی تاریخ کوئی دو سو، سوا دو سو سال پر پھیلی ہوئی ہے اور اس دوران کئی ایسے شعرا نے بھوپال کو اپنا وطن بنایا جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے ممتاز اساتذہ سے تعلق رہا اور انھوں نے خود اپنی شعری کاوشوں سے بھوپال کی ایک متین اور پروقار شعری روایت کی تکمیل میں مدد دی ہے۔ شاہ رؤف احمد رافت جنھوں نے بھوپال کو ایک سنبھلے ہوئے اندازِ غزل سے متعارف کرایا ابتداءً جرأت کے شاگرد تھے۔ مومن کے ایک شاگرد عبدالواحد خاں مسکین نواب جہانگیر محمد خاں کے دربار سے وابستہ رہے۔ انھوں نے مومن کے دوسرے شاگردوں منشی غلام ضامن کرم اور قدرت اللہ بنارسی کے ساتھ مومن کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کو بھوپال میں رواج دیا۔ بھوپال میں غالب کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں محمد عباس رفعت شروانی، نواب یار محمد خاں شوکت، معشوق علی خاں جوہر، سید احمد حسن عرشی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ امیر مینائی کے شاگردوں میں سے قمر الدین قمر، عبدالکریم خاں برہم، عبدالعزیز آہ وغیرہ اور داغ کے تلامذہ میں سے امراء علی عیش اور انور علی انور بھوپال میں تھے۔

یہاں مشاہیر شعراء سے بھوپال کے تعلق اور ان کے شاگردوں کے شعری کمال سے تفصیلی بحث کا موقع نہیں۔ اس مختصر جائزے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ موجودہ صدی کی ابتدا تک بھوپال میں شعر و سخن میں دلچسپی ایک اہم ثقافتی علامت کی حیثیت

سے اعتبار حاصل کر چکی تھی۔ شعر کہنا، مشاعروں میں پڑھنا، گلدستوں میں چھپنا، مشہور شعرا سے اصلاح حاصل کرنا، سماجی افتخار کا باعث سمجھا جانے لگا تھا اور کلاسیکی شاعری کی روایات نے بھوپال کی شعری فضا میں ایک خاص جگہ بنا لی تھی۔

اس شعری فضا سے جو اساتذہ اُبھرے ان میں سے تین کا ذکر یہاں خاص طور پر کیا جا سکتا ہے۔ سراج میر خاں سحرؔ نے اپنے عہد کی شعری روایت کو بڑے نکھار اور شوخیِ اظہار کے ساتھ فروغ دیا۔ انھیں ایک غیر معمولی صناعانہ کمال ودیعت ہوا تھا جس کا اثر ان کی اُچھلتی، بہکتی، مچلتی بحروں، ان کی مترنم تکرارِ لفظی اور ان کی سادہ مگر بانکی لفظیات میں دکھائی دیتا ہے۔

سحرؔ کے شاگرد ذکی وارثی نے بھوپال کی شعری روایت کو ایک واضح اعتبار بخشا۔ انھوں نے ایک ایسی شعری جمالیات کو فروغ دیا جو اثر کے لیے معاملہ بندی کی نہیں بلکہ تہذیبِ فکر و نظر کی مرہونِ منت تھی۔ انھوں نے اپنے شعری کمال سے یہ واضح کیا کہ شعری فضا کس طرح رعایتِ لفظی اور روایتی تلازمات کی بجائے تہذیبِ مذاق اور شستگیِ طبع سے قدر و اثر حاصل کرتی ہے۔

سید محمد میاں شہیدؔ نے بھی کلاسیکی اندازِ شاعری کو بھوپال کی شعری روایت کا حصہ بنانے میں ایک قابلِ قدر کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے کلام میں سادگی اور پُرکاری کا جادو جگا کر دکھایا۔ ان کے یہاں شاعری کا فن ایک شریف و شستہ فن ہے۔ اس میں نہ شعلہ خوئی ہے اور نہ شعلہ جوئی۔ نہ شوخی ہے نہ شرارت۔ نہ شعبدہ گری ہے اور نہ تشکل پرستی۔ ان کے جن شاگردوں کے نام لیے جاتے ہیں ان میں ابن علی عالیؔ، منیرؔ بھوپالی، محمد اسمٰعیل رخشاںؔ، اور حامد سعید خاں حامدؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حامد سعید خاں تک اس طرح ایک ایسی شعری روایت پہنچتی ہے جس میں سلیقے اور توازن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ سلیقۂ اظہار و بیان اور توازنِ فکر و احساس ان بنیادی عناصر کا کام کرتے ہیں جو شعر کو فن کا درجہ عطا کرتے ہیں اور اسے سطحی، بے جان تُک بندی نہیں بننے دیتے۔ یہ شعری روایت انھیں بنے بنائے مضامینِ شعر اور ڈھلے ڈھلائے اسالیبِ اظہار کا ایک ایسا سلسلہ فراہم کرتی ہے جن سے ان کی کائناتِ شعر کی حدود متعین ہوتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ایک ایسے شعری مذاق کی آبیاری بھی کرتی ہے جو انھیں اظہار و خیال کی پستی سے گریز کرنے کے لیے ہر قدم پر ممد و معاون ہوتی ہے۔ یہ روایت جہاں انھیں موضوعات و اسالیب بہم پہنچاتی ہے وہیں وہ ان کی تہذیبِ فکر و نظر کا کام بھی سر انجام دیتی ہے۔

حامد سعید خاں خالصتاً غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل کی پردہ داری، اس کے دھیمے لہجے اور حکمت افروز بصیرت کو پہچانا اور برتا ہے۔ غزل ان کے لیے نہ تو شوریدہ جذبات کا پُرہیجان اظہار اور نہ رجز پڑھتے قافیوں کا پُر آہنگ جواب۔

ان کی غزل نہ تو معاملہ بندی کا طلسم ہے اور نہ قافیہ بندی کا کمال۔ انھوں نے اپنے اشعار میں تغزّل کو ذوقِ دید، سرشاریِ عرفان اور لطفِ اظہار کے مشترکہ تفاعل سے کشید کیا ہے اور ان کی غزل شعور کے پردوں سے قطرہ قطرہ چھن کر آنے والے ادراک سے مرتّب ہوتی ہے۔ ہر کلاسیکی فن کار کی طرح وہ بھی معلوم، محسوس اور مانوس کی تہوں سے نئی تعبیریں برآمد کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور معروف موضوعات اور مروّجہ اسالیب کو فرسودگی اور کہنگی کے الزام سے بری کرتے ہیں۔ انھوں نے سنگلاخ روایت کے سینے سے شرر تاثیر پیدا کیا ہے۔ نزاکتِ خیال اور معنی آفرینی ان کے یہاں بھی ہے لیکن ان کا رشتہ فنّی شعبدہ گری سے نہیں بلکہ مطالبِ حیات کی نقاب کشائی سے جاکر ملتا ہے۔ ان کے یہاں حیران کن ندرتیں بھی ہیں لیکن وہ بطنِ موضوع سے ابھرتی ہیں اور ذوقِ عرفان کو آسودہ کرتی ہیں۔ حامد سعید خاں اس طرح روایت کے دریوزہ گر نہیں، وہ اس کے امین ہیں۔ روایت ان کے لیے اندھے کی لاٹھی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان کا دانائے راز جیسا معاملہ ہے۔ روایت ان کے لیے ایک ایسا شہرِ نیرنگ ہے جس کے ہر کوچے اور ہر موڑ سے واقف ہوتے ہوئے بھی ان کی نگہ رموز بیں کو اس میں اسرارِ نو کی دریافت میں دیر نہیں لگتی۔

اختر سعید خاں نے اپنے والد سے جہاں غزل کی روایت کا احترام کرنا سیکھا وہیں شعر کے تخلیقی منصب کی پاسداری سیکھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں زندگی کا ایک واضح شعور بخشا اور ان کی ابتدائی شاعری نظریے سے وفاداری اور روایت کے ساتھ وضع داری کا ایک خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہے۔ اختر صاحب کی نمایندہ شعری تخلیقات میں یہ توازن برقرار رہتا ہے جبکہ کمتر شعرا کے یہاں نظریے کی وضاحت نعرہ زنی سے سمجھوتہ کرتی نظر آتی ہے۔ اختر صاحب کی غزل کے روایتی استعاراتی نظام سے وابستگی ان کے فکر و شعور کے لیے ایک کارگر ایمائی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی مراحل میں اختر صاحب نے بعض اوقات نظمیہ شاعری کے موڑ پر بھی پڑاؤ کیا ہے اور چند بڑی مؤثر نظمیں تخلیق کی ہیں لیکن ان کی انفرادیت ان کے اسلوبِ غزل سے متعین ہوتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اختر صاحب نے غزل کے منظر نامے کو الٹ پلٹ کیے بغیر غزل کو نئی معنویت سے روشناس کیا ہے۔ اختر صاحب تغزّل کو اپنی شاعری کی روح سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے لیے تغزّل صرف کسی ایسے سلسلۂ علامات کا نام نہیں ہے جسے محض روایت سے استحکام حاصل ہوا ہو۔ تغزّل محض غمزہ شناسی اور چونچلے بازی کا نام نہیں۔ تغزّل اختر صاحب کے لیے احساس کی راہ دبے پاؤں شعور کے تنگ دریچوں کو وا کرنے کا عمل ہے۔ کلامِ اختر کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ اپنے قاری یا سامع کو دعوتِ ہمسفری ایسے لہجے میں دیتے ہیں کہ وہ اپنے آپ ان کی ہم صفیری پر مائل ہو جاتا ہے۔ اختر صاحب کی غزلوں میں جہاں دانشوروں کی

فکر کو آسودہ کرنے کا سامان موجود ہے وہیں بہت کچھ ایسا بھی ہے جو روایتی غزل میں مذکور بزم آرائی اور معاملہ بندی کی یاد دلاتا ہے لیکن اختر صاحب کا شعری مرتبہ اُن کی اس محتاط فکر اور سنبھلے ہوئے رویّے سے متعیّن ہوتا ہے جو ایک طرف ان کے شعر کو محض نظریہ بننے سے روکتا ہے تو دوسری طرف اس میں عام عشقیہ شاعری کی سطحیت پیدا نہیں ہونے دیتا۔

گزشتہ پندرہ بیس سال کے دوران اختر صاحب نے فکر و اسلوب میں ایک گہری ہم آہنگی لانے کی سعی کی ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ ان کے کلام میں فکر کی دھوپ اتنی کڑی نہ ہوجائے کہ تخیل کی قوس قزح پھیکی پڑنے لگے۔ اس زمانے کی غزلوں میں اکثر "پرچھائیں" اور "سایے" کی علامتیں نظر آتی ہیں۔ جو کہیں وہم کی پرچھائیں ہے، کہیں اندیشے کی، جو کہیں زندگی کی پُراسرار کیفیت کی نمائندگی کرتی ہے تو کہیں عدم یقین کی۔ اس علامت کے تواتر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر صاحب اپنے تخلیقی عمل کو نظریے کی بالادستی سے آزادی دلانے کے لیے برابر کوشاں ہیں۔

اختر صاحب کی ابتدائی دور کی شاعری میں اضافت در اضافت تراکیب کا جلوہ نظر آتا ہے اور ان کے پس پردہ، تہ در تہ تاثرات کا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ حالیہ شاعری میں ان کے اسلوب میں وہ کیفیت غالب ہوتی نظر آتی ہے جسے روایتی تنقید میں "رنگ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اختر صاحب کے لیے اب اسلوب کوئی ایسی ٹھوس تدبیر اظہار کی حیثیت نہیں رکھتا جس کے تحت کسی خاص قسم کی بڑھئی گری کی جائے۔ اسلوب اب ان کے تخلیقی عمل کا ایک ایسا فطری بے ساختہ عضویاتی عنصر ہے جس میں عارض محبوب کی طرح اندرونی تاثر کے زیر اثر اپنے آپ تمتما اٹھنے یا کھِل جانے کی صلاحیت ہے۔

اختر صاحب کی نثری تحریرات میں ان کے انشایئے، خاکے اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ انشائیوں کی خوبی جہاں ان کا لطفِ بیان اور شستگیِ اظہار ہے وہیں اختر صاحب کی تہذیبِ فکر و نظر ان مضامین کو ایک خاص اعتبار بخشتی ہے۔ ان کے خاکوں کا موضوع بیشتر ایسی شخصیات ہیں جن سے اختر صاحب کو گہری قربت اور وابستگی حاصل رہی ہے اور یہ خاکے ان کے تاثرات کا مخلصانہ اظہار پیش کرتے ہیں۔ اختر صاحب کے تنقیدی مضامین کی خصوصیت ان کا غیر رسمی اور غیر مکتبی انداز ہے۔ ان مضامین میں شامل بصیرتیں اکثر ان کے طویل تخلیقی تجربے کا نتیجہ ہیں۔

اگلے صفحات میں اختر صاحب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف گوشوں پر مزید روشنی پڑے گی اور اختر سعید صاحب کی نمائندہ تحریرات سے ان کے تخلیقی کارناموں سے بھی تعارف حاصل ہوسکے گا۔

میں جناب شاہد علی خاں صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس نمبر کی ادارت کا موقع دیا۔ جن مصنفین کے مضامین یہاں شامل کیے جارہے ہیں ان کا بھی میں بے حد احسان مند ہوں۔

ڈاکٹر سید حامد حسین

سوانحی خاکہ

نام:۔ اختر سعید خاں تخلص: اختر
پیدائش:۔ ۲ر اکتوبر ۱۹۲۳ء مطابق ۲ر صفر ۱۳۴۲ھ۔ بمقام بھوپال
والد:۔ حامد سعید خاں صاحب حامدؔ (وفات ۱۹۶۰ء) جاگیر دار سابق ریاست بھوپال۔ صاحبِ طرز شاعر۔ شعری مجموعہ "کلام حامد" (مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال، ۱۹۸۱ء)
والدہ:۔ سلامت بی صاحبہ
بھائی بہن:۔ (۱) اظہر سعید خاں (۲) منظہر سعید خاں (۳) سعیدہ واحد (مرحومہ)
شادی:۔ ۷ر جون ۱۹۴۰ء
اہلیہ:۔ منظفر جہاں بیگم صاحبہ
بیٹے بیٹیاں:۔ (۱) شاہد سعید خاں (۲) راشد سعید خاں (۳) جاوید سعید خاں (۴) نوید (۵) یاسمین (۶) نسرین (۷) تسنیم
ابتدائی تعلیم:۔ مڈل اسکول رائسین (ریاست بھوپال)
میٹرک:۔ پنجاب یونی ورسٹی۔ ۱۹۴۰ء
بی، اے:۔ دیال سنگھ کالج لاہور۔ ۱۹۴۴ء
ایل ایل بی:۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی۔ ۱۹۴۶ء
آغاز شاعری:۔ ۱۹۴۰ء کے قریب۔
پہلی مطبوعہ نظم:۔ ۱۹۴۲ء میں ہفت روزہ "چنگاری" (دہلی) میں شائع ہوئی۔
وکالت:۔ ۱۹۴۷ء میں بھوپال میں وکالت کا آغاز۔ مختلف مواقع پر بھوپال بار ایسوسی ایشن کے مختلف عہدوں (جیسے سکریٹری اور صدر) پر فائز رہے۔
ترقی پسند تحریک سے وابستگی:۔ ۱۹۴۷ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین بھوپال سے وابستہ ہوئے جنوری ۱۹۴۹ء میں بھوپال میں منعقد ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں سرگرم حصّہ لیا۔ ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ تا حال اس کے صدر ہیں۔
روپوشی:۔ ریاست بھوپال میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگائے جانے کے بعد

۱۹۵۰ء میں ان کے لیے وارنٹ گرفتاری جاری ہوا۔ اس کی وجہ سے روپوشی اختیار کی اور تقریباً ایک سال بمبئی میں گزارا۔

صحافت:۔ بمبئی کے قیام کے دوران اخبار "مشعل" (بمبئی) میں کچھ عرصہ کام کیا۔

میونسپل ممبرشپ:۔ ۱۹۴۸ء میں بھوپال میونسپل بورڈ کے عام انتخاب میں ممبر چنے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں دوبارہ میونسپل بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے۔

مختلف اداروں سے وابستگی:۔ بھوپال میں آزادی کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کو فعال بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ طویل عرصے تک انجمن کی مقامی شاخ کے سکریٹری رہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ ۱۹۵۷ء سے تا حال قریبی تعلق ہے اور آکاشوانی بھوپال کی مشاورتی کمیٹی کے ممبر رہے۔

حکومت مدھیہ پردیش کے لینگویجز اینڈ کلچر ڈپارٹمنٹ کے ذریعے ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے قائم کی گئی کمیٹی کے ممبر ہیں۔

انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی بھوپال کے ۱۹۵۶ء میں صدر مقرر ہوئے۔

سیفیہ ایجوکیشن سوسائٹی بھوپال کے ممبر رہے۔

بھوپال امن کاؤنسل کے ۱۹۵۵ء میں صدر بنے۔

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے ۱۹۷۶ء میں سکریٹری منتخب ہوئے۔ اب کل ہند مجلس صدارت کے رکن ہیں۔

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے ممبر رہے۔

حج بیت اللہ:۔ ۱۹۸۴ء میں حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کیا۔

اعزازات:۔ ۱۹۸۵ء میں میر اکیڈمی لکھنؤ نے میر ایوارڈ سے نوازا۔

۱۹۸۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جشن طلائی منعقدہ نئی دہلی کے موقع پر نشانِ سجاد ظہیر سے نوازا گیا۔

۱۹۹۲ء میں بھوپال کی ثقافتی تنظیم "مدھوون" نے گروونداتا ہوتسو کے موقع پر ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے اعزاز سے نوازا۔

بیرون ملک اہم تقریبات میں حصہ:۔ (۱) جشن سبط حسن۔ کراچی (۱۹۸۵ء)

(۲) یادِ فیض۔ کراچی (۱۹۸۵ء)۔ ہند پاک مشاعرہ، سیمینار

(۳) پریس کلب پاکستان، کراچی کی خصوصی دعوت۔ (۱۹۸۰ء)

(۴) بین الاقوامی مشاعرہ۔ دوبئی (۱۹۹۱ء)

(۵) متحدہ امارات کے دوسرے مقامات مثلاً ابوظہبی، العین وغیرہ پر مشاعروں میں شرکت۔ (۱۹۹۱ء)

علی سردار جعفری

نغمۂ بلبلِ خوش نوا

یہ غزلوں کا چھوٹا سا خوبصورت مجموعہ اظہار اور بیان کے اعتبار سے کلاسیکی ہے لیکن اس کے اندر جذبہ اور احساس کی جو بجلیاں ہیں وہ عہدِ حاضر کی بصیرت سے روشن اور تابناک ہیں۔ اس طرح یہ قدیم اور جدید کا امتزاج ایک نئی جمالیاتی کیفیت پیدا کرتا ہے اور روح کے لیے انبساط کی ایک نئی سطح تلاش کرتا ہے۔ میں انبساط "لطف اندوزی کی اس کیفیت کو کہتا ہوں جو نشاط و غم دونوں سے یکساں طور پر فیض یاب ہوتی ہے۔ یہ تصوف نہیں ہے بلکہ تہذیب نفس ہے اور یہ تہذیب نفس اور اچھا شعر لازم و ملزوم ہیں۔ تہذیب نفس کے بغیر اچھے شعر کی تخلیق ممکن نہیں ہے اور شاعرانہ تخلیقی صلاحیت تہذیب نفس کا سامان فراہم کرتی ہے اور قاری جب اچھے شعر سے لطف اندوز ہوتا ہے تو اس کی روح کو بھی تہذیب نفس کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے میرا یہ عقیدہ ہے کہ جو لوگ رشک و حسد کا شکار ہو کر اچھے شعر کی داد نہیں دیتے وہ خود اپنی روح کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور ایک روحانی لذت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس فعل بد کے مرتکب بعض ناقدوں کی طرح بعض اچھے شاعر بھی ہوتے ہیں اور سزا کے طور پر خوب سے خوب تر کی طرف ان کی تخلیقی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ کسی غالب کسی اقبال نے اس طرح کے بخل سے کام نہیں لیا لیکن ان کے منکرین اس عذاب میں مبتلا ہوئے۔

معنی اور مفہوم کے بغیر شعر کچھ بھی نہیں ہے لیکن شعر معنی و مفہوم سے کچھ زیادہ بھی ہے اور یہی اچھا شعر ہے، اس کو بزرگوں نے "ماورائے سخن بھی ہے اک بات" کہہ کر واضح کیا ہے، اس اچھے شعر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ لمحاتی کیفیت سے بلند ہو کر وقت کی قید سے بے نیاز ہو جاتا ہے جیسے ہم ہر زمانہ کی سچائی کہیں اور اسی کے ساتھ آج کی سچائی میں ظاہر ہو۔ اختر سعید خاں کی ایک غزل کے یہ دو شعر ہیں ؎

ہے دیدنی رنگِ روئے قاتل	ہر زخم جواب مانگتا ہے
اے دشتِ جنوں گواہ رہنا	کانٹے ہیں اور اک برہنہ پا ہے

پہلا شعر آج کے جبر و استبداد کے خلاف شاعرانہ احتجاج بھی ہو سکتا ہے آخر یہ کس جرم کی سزا ہے؟

جواب نہیں بن پڑتا تو قاتل کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ یہ رنگ غیظ و غضب کا بھی ہو سکتا ہے، اور شرم کا بھی۔ لیکن یہ شعر وقتی نہیں ہمہ وقتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ زندگی کا کوئی ایسا دور بھی آسکتا ہے جب زمانہ قاتلوں سے خالی ہو گا۔ سیاسی قاتل نہیں رہ جائیں گے تو دل کے قاتل تو ہمیشہ تیغ جمال بے نیام کرتے رہیں گے۔ اسی لیے اردو شاعری میں محبوب کو قاتل بھی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جذبہ و احساس کے قاتل بھی ہوں گے جو دوستوں کی محفلوں میں بھی ملیں گے اور دشمنوں کے ہجوم میں بھی۔ اور وہ کون سا دور ہو گا جب انسان تنہا نہیں ہو گا، ہم انسان کی سماجی ذمہ داریوں کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس پر اصرار کرتے ہیں لیکن ہر انسان انجمن کے ہجوم میں بھی اپنی ایک خلوت رکھتا ہے اور ہر خلوت ایک انجمن ہوتی ہے جس میں محشر خیال برپا رہتا ہے دوسرے شعر میں دشت جنون، کانٹے اور برہنہ پا سب لازوال استعارے ہیں۔

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

باعث رشک ہے تنہا روی رہروِ شوق
ہمسفر کوئی نہیں دوریٔ منزل کے سوا

یہ دونوں شعر جن میں ایک پرانے شاعر کا ہے اور دوسرا آج کے عہد کے شاعر کا، انھیں لازوال استعاروں کا اظہار ہیں جن کے ذریعے سے انسان اپنی انتہائی مسرت اور انتہائی غم کے عالم میں تنہا ہو جاتا ہے۔ ٹیگور کی مشہور نظم 'ایکلے چالو، (اکیلے چلو) جسے مہاتما گاندھی نے نواکھالی کے فسادات کے وقت بہت زیادہ استعمال کیا۔ اس حقیقت کا اظہار ہے جب صداقت کی جنگ میں کوئی ساتھ نہ دے تو اکیلے چلو، مسیحؑ ابن مریم صلیب پر تنہا تھے اور حسینؓ ابن علیؓ شمر کے خنجر کے نیچے تنہا۔ غالب نے اس تنہائی کو ایک دوسرے انداز میں پیش کیا ہے جو ایک دانشور شاعر کا انداز ہے ؎

رشک بر تشنہ و تنہا روِ وادی دارم
نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزم شاں

اور آج جب حق و صداقت، انسانیت کے انقلابی آدرش اندھیروں میں گم ہوتے جا رہے ہیں تو کوئی بھی مجاہد اور حق کا متلاشی اس شعر سے اپنے عمل کی راہ متعین کر سکتا ہے۔

اے دشتِ جنوں گواہ رہنا
کانٹے ہیں اور اک برہنہ پا ہے

اور جب یہ برہنہ پا کانٹوں کی پیاس بجھاتا ہوا آگے بڑھے گا تو اسے اختر سعید خاں کا ایک اور شعر سہارا دے گا۔

آبلہ پا سہی لیکن مری رفتار تو دیکھ
گردیں سوئے ہوئے نقشِ قدم جاگ اٹھے

ہمارا ماضی ہمارے آج کے وجود سے زندہ ہے اور یہ دونوں مل کر مستقبل کے امکانات پیدا کرتے ہیں، آبلہ پا جیسی بار بار استعمال ہونے والی ترکیب کے باوجود یہ شعر تازہ اور بہت اوریجنل ہے۔ اختر سعید خاں کے دوست مجروح سلطانپوری کا بھی ایک نہایت اوریجنل اور خوبصورت شعر ہے

بے تیشہ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

مجروح نے زندہ روایت کی عظمت کی بات کی ہے اور اختر سعید نے کھوئی ہوئی روایت کی بازیافت کا نکتہ پیدا کیا ہے، ہم روایت کا تسلسل برقرار رکھ کر روایت سے بغاوت کی بات کرتے ہیں، مجروح کا شعر تیشہ نظر سے ان روایتوں کے پہاڑوں کو کاٹتا ہوا چل رہا ہے جن کی عظمت کا اعتراف ضروری ہے اور اختر سعید خاں کا شعر سوئی ہوئی روایت کو جگا کر آج کے عہد سے ہم آہنگ کر رہا ہے، دونوں کے شعور کی لہریں (WAVE LENGTH) ایک ہیں لیکن انداز الگ الگ ہیں، ادائیں الگ الگ ہیں۔ ان اشعار کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ ترقی پسند شاعر ماضی کی عظمتوں کے دشمن ہیں۔ ہم ان کے پاسبان ہیں اور اس حیثیت سے ان عظمتوں کے دشمنوں کے دشمن ہیں اور اتفاق سے ان عظمتوں کے دشمن وہ ہیں جنھوں نے انھیں اپنی جاگیر بنا کر ان کا استحصال کرنا اپنا حق سمجھ رکھا ہے۔

اختر سعید خاں کی غزل زندگی کی بہت سی کیفیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، اور ان کا اظہار ان اشعار میں ہوا ہے ؎

یہ شمع رہگزر ہے اس کو جلنے دو ہواؤں میں
تہ دامن نہیں رکھتے چراغِ فکر و فن اختر

جہاں مصلوب ہیں حرف و نوا زر کی صلیبوں پر
وہاں بھی ہم سے دیوانے ہیں اب تک نعرہ زن اختر

ہمارے بہت سے نقاد اور نغمہ زیر لبی کے عاشق اس نعرہ زنی پر معترض ہوں گے لیکن یہ بھی اقبال کی روایت ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد

اور یہ مصرع اس نظم کا ہے جس کا عنوان میلاد آدم ہے۔ ایک روشن خیال اور صحت مند ذہن کے شاعر کے لیے، حرف ولوا ماضی کی طرح آج کے عہد میں بھی میحا کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے انسان دشمن طاقتیں اور ظالم وجابر اقتدار کے ادارے ان کے قتل پر آمادہ رہتے ہیں، اور ہمارا کہنا یہ ہے

کوئی قاتل ہو مگر قتل نوا ہو نہ سکے

ن، م راشد نے اپنی کتاب، لا انسان، میں لفظ کو سب سے بڑا احتساب قرار دیا ہے، اور یہ لفظ راشد کے بیان کے مطابق کارل مارکس کے پاس بھی تھا اور اقبال کے پاس بھی، سقراط بھی اس لفظ کا سرمایہ دار تھا۔

آج کے عہد کی صلیب کو زر کی صلیب کہہ کر شاعر نے سرمایہ دارانہ نظام کی نشاندہی کی ہے جس نے حرف ولوا کو خریدنے اور رسوا کرنے کا کاروبار جاری کر رکھا ہے اور یہ حرف جب بکتا ہے تو کھوٹا ہو جاتا ہے، حرف عیسیٰؑ کے زمانے میں بھی چند سکوں کے بدلے فروخت ہوا تھا ورنہ ابن مریم کو صلیب تک نہ جانا پڑتا۔

میرے بیان سے یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ اختر سعید خاں کی کل کائنات اس کے سوا کچھ نہیں۔ ان کا موضوع سخن پوری کتاب زندگی ہے ؎

کتاب زندگی اس گھر کی دیواروں پہ لکھ آئے
اب اس کے بعد باقی کیا ہے موضوع سخن اختر

ان کی پہلی غزل جو میں نے پچیس تیس سال پہلے سنی تھی اور انھیں کی زبانی سنی تھی اس میں بھی شاعر نے اپنے نقطۂ نگاہ کو دلکش انداز سے پیش کیا ہے۔ یہ یقین اور اعتماد کی غزل ہے، یقین اور اعتماد جو اس تصور سے پیدا ہوتا ہے کہ بدی لافانی نہیں ہے اور بدی کے خلاف لڑنے والا کوئی مجاہد یا شاعر تنہا نہیں ہے چاہے اس کی زبان پر ٹیگور کی نظم ہی کیوں نہ ہو، ایکلے چالو، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی

ہمصفیران چمن مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں خوابیدہ کہیں باد بہاری ہوگی

بوئے گل آتی ہے مٹی سے چمن کی جب تک
ہم پہ دہشت نہ خزاں کی کبھی طاری ہوگی

ان اشعار کا آہنگ بلند ہے اتنا ہی بلند جتنا اقبال اور غالب کی غزل کا آہنگ

بلند ہے، ایسی باتیں سرگوشی میں نہیں کی جاتی ہیں۔ اس مقام پر شاعر پیغمبر کی زبان استعمال کرتا ہے ؎

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا — اقبال

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو — غالب

ہاتھ دامن پہ ترے مارتے جھنجلا کے نہ ہم
اپنے دامن میں اگر آج گریباں ہوتا — میر

یہ بے وزن دبے آہنگ چیلنج نہیں ہے۔ اس میں غزل کی ساری لطافتیں اور نزاکتیں سموئی ہوئی ہیں۔ اختر سعید خاں کی شاعری میں بڑا تنوع ہے۔ اس میں پرانی زمینیں بھی ہیں اور نئی زمینیں بھی۔ اجتماعی غموں کے ساتھ ساتھ شاعر کے ذاتی غم بھی ہیں، ذرا اس شعر کی نزاکت دیکھیے ؎

مجھے ہر بات پر جھٹلا رہی ہے
یہ تجھ بن زندگی کو ہو گیا کیا

اس شاعری میں ایسی جمالیاتی کیفیات بھی ہیں جیسے ؎

بدل چکی رت مگر ابھی تک فضا میں کچھ دھوپ چھاؤں سی ہے
حسین مکھڑوں کی چاندنی سے سیاہ زلفوں کی برہمی ہے

ان جمالیاتی کیفیات میں بڑی عاشقانہ معصومیت اور سادگی ہے ؎

میں نے جس خواب کو آنکھوں میں بسا رکھا ہے
تو بھی ظالم مرے اس خواب کی تعبیر میں ہے

میں نے مانا ایک نہ اک دن لوٹ کے تو آجائے گا
لیکن تجھ بن عمر جو گزری کون اسے لوٹائے گا

یہ سطح اور بلند ہوتی ہے اور کچھ غزلوں میں شاعر غالب کے انداز میں زبان کی تخلیقی تہیں دریافت کرتا ہے اور جمالیات پر نئی کیفیات کا عکس پڑتا ہے۔ اور معنوی گہرائی پیدا ہوتی ہے ؎

نظر فریبی گلہائے نقش پا معلوم
تمام عمر مگر تیری جستجو تو رہے

یہ سفر ایک آئیڈیل اور ایک آدرش کی منزل کی طرف لے جاتا ہے اور شاعر یوں نغمہ سرا

ہوتا ہے۔

ہوائے موسم دیوانہ گر کچھ اور ہوتی ہے
چمن والو بہاراں کی سحر کچھ اور ہوتی ہے
پتہ یوں تو شگفتِ گل سے بھی ملتا ہے موسم کا
جو دیوانے سے ملتی ہے خبر کچھ اور ہوتی ہے

اس مختصر سے دیوان میں بہت اچھے اچھے شعر ملیں گے، میں ان کو دیباچے میں نقل کرنے سے اس لیے گریز کر رہا ہوں کہ قاری جمالیاتی دریافت اور حیرت کی لذت سے محروم نہ ہو جائے، بس ایک شعر پر اکتفا کروں گا ؎

شوخیٔ وحشت جنوں کے ہم بھی قائل ہیں مگر
جب ذرا فرصت ملے دامن رفو کرتے رہو

اختر سعید خاں کی شاعرانہ تربیت میں سارے ہندستان کے شاعروں کا حصہ ہے جو ان کے والد محترم حامد سعید خاں صاحب کے گھر مہمان ہوتے تھے اور اختر کی روح شعروں کے پھولوں سے بھر جاتی تھی۔

ان کے بھائی اظہر سعید خاں بھی اتنی ہی دلکش شاعری کرتے ہیں لیکن دونوں بھائی گوشہ گیر ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، وہ شعر صرف اس طرح کہتے ہیں جیسے بلبل گاتی ہے، اس کی بلا سے کوئی اس کا نغمہ سنے یا نہ سنے وہ تو ہر فصلِ بہار میں گاتی ہی رہے گی۔

آج بھوپال کے خوشنوا بلبل کا یہ نغمہ سب کے لیے فردوسِ گوش ہے۔

("نگاہ" کا دیباچہ)

رشید حسن خاں

رشید حسن خانصاحب ۔ بنام اختر سعید خاں

خانِ والا شانِ بسیار مہربان دوستاں

بسلامت باشند

کتاب کا پارسل ملا تھا۔ حسن ظاہر کو دیکھ کر آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی، اور پڑھ کر دل میں سرور اور نگاہوں میں نور شامل ہوگیا۔ ایک دور افتادہ شخص نے اس التفات خاص کا لطف اٹھایا۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔

اتفاق بلکہ حسن اتفاق کہوں کہ پہلی بار کتاب جب کھولی تو جو صفحہ سامنے آیا اس پر پہلا یہ شعر تھا۔

جب بھی بیتے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہوں
کوئی آواز میں آواز ملا دیتا ہے

دوسرا مصرع دل پر نقش ہو کر رہ گیا۔ میں جہاں رہتا ہوں اس کے پاس ہی یونی ورسٹی گارڈن ہے۔ شام کو اکثر ادھر چلا جاتا ہوں، یہ بھی شام ہی کا وقت تھا بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا اور دیر تک وہاں ٹہلتا رہا اور اس شعر کو دوہراتا رہا۔ کیا کہوں کس کیفیت سے دوچار ہوا۔ یوں کہوں کہ سرشار ہوا اس شعر کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس نے عرفی کا یہ شعر پڑھا ہو!

کسیکہ محرم باد صباست میداند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست

جو شخص یہ محسوس کر سکے کہ فضا میں ابھی بوئے یاسمن باقی ہے وہی اس "آواز میں آواز ملا دیتا ہے" کے لطف پنہاں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں احساس ہی احساس کارفرما ہوتا ہے اور سماجی حقیقت نگاری کی ساری ظاہر فریبیاں سیمیا کی سی نمود بن کر رہ جاتی ہیں۔

صاحب آپ تو مجھے اپنے قبیلے کے فرد نظر آئے جس کا مدت کے بعد پتا نشان ملا ہو۔ آپ کی وضع داری کی تعریف دوسروں سے سنی تھی مگر یہ سب میرے ترقی پسند احباب تھے، جن کی باتوں پر میں عموماً اعتبار نہیں کرتا اور ایمان نہیں لاتا۔

مگر آپ کے اشعار پڑھ کر آپ کی بے ریا شخصیت سامنے آگئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بجا طور پر آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی، اس فصل بہار کے تاثرات جہاں جہاں تہ نشین ہو گئے ہیں، نقش ابھر آئے ہیں اور شعر بول اٹھے ہیں۔ ہائے ہائے کیا شعر کہا ہے۔

سارا بدن ہے دھوپ میں جھلسا ہوا مگر
دل پر جو پڑ رہا ہے وہ سایہ عجیب ہے

اور یہ بقول آپ کے نیرنگئ نشاط تمنا ہے جس سے ہمارے عہد کے اکثر "نئے زمانے والے،، نا آشنا ہیں اس لیے کہ یہ بد نصیب ہیں فطرت نے انھیں عمر بھر کی سزا دی ہے کہ اس احساس سے محروم رکھا ہے باقی سب احساس جگا دیے ہیں۔

میرے دوست سردار جعفری کچھ بھی کہیں حقیقت یہ ہے کہ آپ کا اصلی رنگ وہی ہے جہاں "از دل خیزد،، والی بات کار فرما رہی ہے۔

جرم کی طرح محبت کو چھپا رکھا ہے
ہم گنہگار نہیں ہیں، یہ بتائیں کس کو

مجھے ہر بات پر جھٹلا رہی ہے
یہ تجھ بن زندگی کو ہو گیا کیا

جیسے سب طے ہو چکے ہوں زندگی کے مرحلے
سوچتا ہوں اور کوئی کام یاد آتا نہیں

یہاں بھی دوسرا مصرع اپنی شناخت کا اعلان کر رہا ہے۔

اور اب ایک دلچسپ مگر عجیب بات کہوں۔ مدت سے ایک غزل کے دو شعر دل پر نقش تھے۔ تنہائی کے لمحوں میں جب سب عکس بے نمود ہو جایا کرتا تھے اور کچھ بھی یاد نہیں آپاتا تھا یہ دو شعر زبان پر جاری ہو جایا کرتے تھے۔ میں نے کئی بار بعض احباب کو یہ شعر سنائے کہ یاد نہیں کس کے شعر ہیں، مگر کوئی دل دکھا اور میر کے لفظوں میں آفت رسیدہ۔ معلوم نہیں یہ خیال کیوں دل پر بیٹھ گیا تھا۔ یہ کوئی پاکستانی شاعر ہے۔ کئی بار یہ خیال آیا کہ یہ دولتِ درد ادھر تو کچھ کم یاب ہے وہاں تو نئے تجربے ہیں یا برہنہ گفتاری کے مظاہرے یا بچھڑ گئی ہوئی زندگی اور بکھری ہوئی تہذیب کا ماتم، جس کی یاد ابھی تک وہاں سے مٹی نہیں ہے یہ کلاسیکیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا انداز اور یہ بے لاگ اور بے لگا و حکایتِ احساس ادھر کی ہواؤں کے جھونکوں سے اس کی خوشبو تو کبھی ملی نہیں۔ اب اس مجموعے کو دیکھا تو اچانک یہ شعر نظر آگئے، دیر تک حیرت انگیز مسرت کا عالم طاری رہا۔

۱؎ پھونک ڈالے گی تپشِ غم........

۲؎ زندگی چھین لے.... تو نے خوابوں کے سوا مجھ کو دیا بھی کیا ہے

یہاں بھی دوسرے شعر کا دوسرا مصرع چھری نہیں نشتر بن کر رگ وپے میں اتر گیا ہے۔ یہ شعر کوئی ظاہر آرائی کا مارا کہہ ہی نہیں سکتا، وہی کہہ سکتا ہے جس کے قلب میں اتنی گہرائی ہو کہ یادیں محفوظ ہو کر متحرک رہیں اور احساس کو سیراب کرتی رہیں۔

چھیڑ کے قصئہ مہر و وفا کے باتیں لوگ بنائیں گے
تم سے چھٹ کر جینے والے جی کے بہت شرمائیں گے

اس لہجے میں شعر کہنے والا اب کون بچا ہے؟ یہاں بھی دوسرا مصرع دل میں اتر جانے والا ہے خاص کر اس کا آخری ٹکڑا اس غزل کے یہ شعر یادداشت کا حصّہ بن جاتے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

۳؎ ان جانے میں دل کا قصّہ......

۴؎ اب کے بہاریں لے دل والو......

(یہاں 'اب کے' میں نے لکھا ہے، اس کی معذرت)

اور پھر یہ غزل، توبہ توبہ کچھ دیر کے لیے جی بے طرح اُداس ہو گیا۔ کیسی ظالم غزل ہے اور کس قدر تاب شکن اور صبر آزما۔

۵؎ ایک سایہ ہے کہ پیچھا کر رہا ہے آج بھی

مجھے تو اس غزل کے پڑھتے وقت اور اس کے کچھ بعد تک یہ محسوس ہوا کہ جی ڈوبا جائے ہے مطلع واقعتاً مطلع آفتاب ہے۔ مگر عنوان صبح ماتم بن کر دل کو برما رہا ہے اللہ جانے وہ کیسی سرگزشت ہے جس کی یاد اس قدر دل دوز ہے کہ آنچ قفس والوں تک آئی۔ کیسے کیسے شعر کہے ہیں آپ نے مگر جہاں جہاں آپ بہکانے میں آ گئے ہیں ظاہری دنیا کے، وہ عقیدہ کیوں نہ ہوں اور ذہنی رویہ کیوں نہ ہو وہاں وہاں دل کی آواز دب گئی ہے کہیں کہیں ڈوب گئی ہے۔ اس بے وفائی کی آپ سے شاعری کو شکایت رہے گی اور مجھے تو ہے۔

ایک اور بات جب میں نے آپ کا یہ شعر پڑھا

بجھ گئے اک ایک کر کے سب عقیدوں کے چراغ   اے زمانے کی ہوا اب یہ بتا ہم کیا کریں

۱؎ پھونک ڈالے تپشِ غم تو بُرا بھی کیا ہے
چند یادوں کے سوا دل میں رہا بھی کیا ہے

۲؎ زندگی چھین لے بخشی ہوئی دولت اپنی
تو نے خوابوں کے سوا مجھ کو دیا بھی کیا ہے

۳؎ انجانے میں دل کا قصّہ چھیڑ دیا معلوم نہ تھا
ہم یہ فسانہ کہتے کہتے افسانہ بن جائیں گے

۴؎ اب کی بہاریں لے دل والو چاک جگر کی باری ہے
پچھلے دنوں کے تار گریباں اب کے کام نہ آئیں گے

۵؎ ایک سایہ ہے کہ پیچھا کر رہا ہے آج بھی
کون ہے یہ جو مجھے پہچانتا ہے آج بھی

اور پھر یہ شعر سامنے آیا۔

باد بہاری اتنا بتادے سادہ دلانِ موسم کو
صرفِ چمن جو خون ہوا ہے رنگ وہ کب تک لائے گا

تو بے اختیار مرحوم جاں نثار اختر کی یاد آگئی۔ ان پر بھی شکست کا یہی عالم آخر میں گزرا تھا۔ کئی شعروں میں اس کا اظہار از خود ہو گیا تھا۔ جس پر ان کو ترقی پسند ادب کی سرزنش بھی سننا پڑی تھی اور یہ بھی سننا پڑا تھا کہ اب اختر اکہرے شعر کہنے لگے ہیں مگر ان ''سادہ دلانِ موسم''، کو کیا معلوم کہ احساس زندگی ہو تو عقیدے کی شکست کا یہ احساس ضرور ہو گا۔ تاریخی حقیقت کو کون کب تک جھٹلائے گا سچا شاعر اس سے کلیتاً محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ہاں وہ لوگ ضرور محفوظ رہیں گے جنھوں نے بیشہ ورانہ زندگی بسر کرنا اپنے لیے لازمی قرار دے لیا ہے۔ یہ آیت ایسے ہی لوگوں کے لیے اُتری ہے۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ۔ دل پر مہر لگنا اسی کو کہتے ہیں کہ احساس زندگی نہ رہے۔

آپ کا کلام اگر زبان و بیان کے معائب سے محفوظ ہے تو مجھے اس پر ذرا بھی تعجب نہیں، زندگی ہو، عاشقی ہو، عقیدہ ہو کہ شاعری، میرا خیال ہے کہ ان سب سے آپ نے عہد وفا باندھا تھا اور جو ان سب سے عہد وفا باندھ کر نباہنے کا حوصلہ رکھتا ہو، اس کے یہاں معائب کو جگہ مشکل ہی سے مل سکتی ہے وہ زبان و بیان کے ہوں یا احساس و اظہار کے البتہ ''خالِ رخ زیبا'' والی روایت کے طور پر بس ایک جگہ میری نظر رکی۔

شعاعِ آفتاب سے میرا نشاں اُٹھائیے

یہاں نشان اٹھانا محلِ نظر معلوم ہوتا ہے۔

رسید کا خط لکھنے بیٹھا تھا وہ طومار بن گیا۔ اس درازنفسی پر معذرت طلب ہوں اور تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اچانک یاد کیا اور ایسے تحفے سے نوازا کہ روح خوش ہو گئی۔ کبھی اس دیار کا پھیرا تو ہوتا ہو گا۔ اگر اب اس کی نوبت آئے تو اطلاع دیجیے گا۔

ملاقات کی تمنا ہے اور بہت سی باتیں کرنے کا اشتیاق۔ تحقیق کا مارا ہوا اور لغت و قواعد کا ستایا ہوا ایک شخص کچھ دیر کے لیے اس دنیا میں لوٹ جانے کی آرزو رکھتا ہے جو بہت پہلے چھوٹ گئی تھی اور اب جنت گم گشتہ بن گئی ہے۔ ۱۱ر دسمبر سے بمبئی کی یونی ورسٹی میں ایک انٹر نیشنل سیمینار ہے اس میں جانا ہے۔ افسوس کہ گاڑی کے راستے میں بھوپال نہیں پڑتا، ورنہ اتر پڑتا اور چند گھنٹے ایسے گزرتے کہ ساری تحقیق و تنقید فراموش ہو جاتی۔

ڈاک کا آج کل احوال عجب ہے کہ دیکھیے یہ خط بہ حفاظت پہنچتا ہے۔ رسید اگر آپ بھیجیں گے تو مزید شکریہ ادا کروں گا۔

مجروح سلطانپوری

اختر سعید خاں اختر

(بھوپال کی مردم خیز سرزمین کا ایک بلند قامت نام)

اہل قلم وہ دن بھولے نہ ہوں گے جب ۴۹ء کی بھیمڑی کانفرنس میں ترقی پسند ادب و شعر کے ارباب اقتدار بزعم خود غزل کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر اس طرح فارغ ہوئے تھے جس طرح کسی زمانے میں موسیقی کو دفنا کر اطمینان کا سانس لیا گیا تھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ یہ فارغ ہو سکے نہ وہ مطمئن۔ نہ موسیقی دفن ہوئی نہ غزل۔ ہمارے ترقی پسند پیش رو احباب کی کج روی ابھی جاری تھی کہ ترقی پسندوں ہی میں کچھ سر پھرے ایسے بھی نکلے جنھوں نے غزل کو اپنے عہد کا ترجمان ثابت کر دکھایا۔ انھیں میں کا ایک نام اختر سعید خاں اختر ہے۔ ان لوگوں نے یہ بھی باور کرایا کہ شعر و ادب کی زمین کا کوئی قطعہ بنجر نہیں ہوا کرتا۔ ویسے جناب علی سردار جعفری نے ۵۶ء میں میرے مجموعہ کلام "غزل" پر پیش لفظ کے طور پر کچھ لکھ کر میرا دل بڑھایا تھا مگر جو یقین اب اختر کے مجموعۂ کلام "نگاہ" کے دیباچے میں جعفری صاحب کے یہاں ملتا ہے کہ یہ بھی انھیں کا تحریر کردہ ہے، وہ یقین ۵۶ء کے میرے مجموعے کے پیش لفظ میں نہیں ملتا۔ سبب صرف یہ ہے کہ اس وقت ترقی پسند غزل کی ابتدا تھی جتنا انھوں نے دیکھا ان کی نظر وہیں تک رہی۔ کسی دور بینی کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ شروع میں یہ غزل کے موافقین میں نہیں تھے اور اس مایوسی کا اظہار مجھ سے جب اور تب کرتے رہتے تھے۔ تفصیل میں نہ جاؤں گا۔ اور اب میں ہوں یا اختر یا دوسرے قابل ذکر رفقا۔ سب کے مقابلے میں اہل قلم نے ہمیں قابل ذکر۔ نہ جانتے ہوئے صرف فیض کی ذات سے غزل کو وابستہ کر دیا چنانچہ آج ترقی پسند غزل کے ساز پر ہی ایک نام گونج رہا ہے۔ فیض کی غزلوں کے حسن سے اغلاطِ زبان کی بھرمار کے باوجود انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اب تو یہ ایک رویہ بن گیا ہے کہ ہمارے نقاد حضرات نے شاد، حسرت، فانی، جگر، یگانہ اور فراق کی غزل سے اڑان بھری تو پچھے سات سال کے ایام کو جن کے درمیان دو طرفہ پتھراو کے باوجود ترقی پسند غزل اس نام سے وجود میں آئی اور پروان چڑھی۔ یہ حضرات ان تمام مہ و سال کو اپنے پر پرواز کے نیچے گرد کی طرح جھاڑتے ہوئے سیدھے فیض پر آکر ٹھہرنے لگے۔ جب یاروں کی زور پرواز کا یہ عالم ہو تو اس جھونک میں بے چارہ اختر وہ کیا نظر آئے۔ بلکہ آج اردو کے ادیبوں میں عالمی طور پر کتنے ایسے ہوں گے جو یہ تک نہیں جانتے کہ

اختر کا مجموعہ کلام "نگاہ" کے نام سے برسوں پہلے شائع ہو چکا ہے۔ غرضیکہ ان سخت جانوں کو قابل ذکر نہ سمجھنے کا رویہ عام ہو گیا ہے جنھوں نے کیا کیا بولیاں ٹھولیاں نہ سہیں، کہاں کہاں نظر انداز نہ ہوئے۔ ایک بار احتجاجاً یہی بات میں نے ڈاکٹر محمد حسن صاحب سے کہی تو انھوں نے پُرخیال ہو کر اثبات میں گردن ہلائی اور چند ہی دنوں بعد ایک مضمون لکھا "سجیلا غزل گو"، اس میں انھوں نے میرا ذکر فیض کے ساتھ اور فیض کے بعد کرتے ہوئے یہ کہا کہ ترقی پسند غزل کی تعمیر میں میری اوّلیت کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔ کس نے پہل کی کس نے نہیں۔ یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ (الفاظ یہ نہیں ہیں مگر مفہوم یہی ہے) یعنی ترقی پسند غزل کے طبقاتی شعور کے ساتھ وجود میں آنے والے اس کے ارتقا اور چمن بندی کے وہ سخت اور مظلوم مگر کامیاب مہ و سال جن کا دامن "دست صبا" تک سے جا ملا۔ ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ تاریخ غزل کا ایک اہم ترین ورق گویا زائدِ محض ہے۔ انا للّٰہ! القصّہ اسی ورق پر لکھا ہوا ایک روشن نام اختر سعید خاں اختر ہے۔ اختر کا کلام ہم میں ابتداً بھی محض چند جبینیں نہیں رکھتا تھا بلکہ ہمیشہ سے ہشت پہل اور رنگا رنگ ہے۔ زندگی کی طرح ماضی وحال کی ہر جہت سے باخبر اور مستقبل پر نظر جمائے ہوئے اختر کا یہ شعر کسے نہ یاد ہو گا۔

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہو گی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہو گی

مجھے تو ابتدا ہی سے اختر کے غزل کے رفیق ہی نہیں اس کے دست و بازو جیسے نظر آئے۔ ان کی غزل کی حسن کاری و ہمہ جہتی نے یہ بتایا کہ زندگی کا موضوعِ شاعری محض سیاست اور طبقاتی آویزش نہیں ہے یہ تو منزل سے پہلے کے نشیب و فراز ہیں جب کہ منزل حیات، انسانی جمالیات ہے۔ اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَال۔ منزل تک پہنچنے کے لیے اگر ہمیں سیاست سے احتجاج و آویزش سے، دار و زنداں سے گزرنا پڑے تو غزل میں ان وقتی موضوعات سے غزل کے نام پر پہلوتہی ابلہی و نادانی ہے بقول انھیں کے ؎

جہاں مصلوب ہیں حرف و نوا زرکی صلیبوں پر وہاں بھی ہم سے دیوانے ہیں اب تک نعرہ زن اختر

ہمت ہار جانا ان کا شیوہ نہیں ہے۔ اکیلے کھڑے ہیں مگر آواز سب کو دے رہے ہیں۔

ہمصفیرانِ چمن مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہو گی۔

ایک باخبر خوش ذوق کی طرح ان کے شب و روز خواہ کہیں بھی ہوں حسن و عشق کے شب و روز ہیں ان کے بیان کی سلاست وحلاوت بظاہر فریب دیتی ہے کہ جو کہنا تھا مزے میں کہہ گئے حالانکہ انھیں جو کہنا ہے وہ سطح پر نہیں کئی تہوں کے نیچے ہے ان اشعار پر آپ چاہیں تو کتنا کچھ لکھ سکتے ہیں۔

مجھے ہر بات پر جھٹلا رہی ہے
یہ تجھ بن زندگی کو ہو گیا کیا

شوخیِ دستِ جنوں کے ہم بھی قائل ہیں مگر
جب ذرا فرصت ملے دامن رفو کرتے رہو

اور یہ اشعار

جو زخم دے کے گئی ہے ابھی نسیم سحر
سکوتِ گل سے عیاں ہے ذرا سنبھل کے چلو

بچا کر رکھ لیا ہے ایک اک تارِ گریباں کو
خدا جانے کہ اس موسم میں دستورِ جنوں کیا ہو

لے اڑی موجِ بہاراں یہ الگ ہے ورنہ
آج بھی پانو مرا خانۂ زنجیر میں ہے

صفحۂ ہستی پہ اب تک نقش ہیں سب ناتمام
چشم خوں بستہ رکھو، دل کو لہو کرتے رہو

یہ تو ہانڈی کے چند چاول ہیں جو اندازہ لگانے والوں کے لیے کافی ہیں۔ قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا۔ اب سیکڑوں میں سے چند وہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں جو کتابی شکل ابھی نہیں پا سکے ہیں۔

ہاں یونہی زیرِ دار رہے زندگی کا رقص
مقتل میں جشنِ مستیٔ کردار کچھ تو ہو
قیمت متاعِ جاں کی اجل کیا چکائے گی
سودا یہ زندگی کا ہے تکرار کچھ تو ہو

عشق میں ترکِ رسمِ جنوں پر لوگ نہ دیں الزام بہت
ان کے بھی کچھ اپنے غم تھے ہم کو بھی تھے کام بہت
اس موسم میں اپنے سوا کیا چاک گریباں کوئی نہیں
کل تک تو دیوارِ چمن پر لکھے ہوئے تھے نام بہت
دیکھیے اب کے مقتلِ جاں میں چھیڑ کدھر سے ہوتی ہے
موجِ لہو کی اوج پہ ہے اور تیغ ہے خوں آشام بہت

آج کل کے پس منظر میں دیکھیے۔

گھر جلا اس کا بدل دے دیجیے
چھوڑیے جان کی قیمت کیا ہے

ہم ہیں اور دانش ماضی کا عذاب
عہد نو تیری بشارت کیا ہے

اے رقصِ گمانِ موسمِ گل
سبزہ پامال ہو گیا ہے

کس کا منہ دیکھ رہی ہے سفر آمادہ حیات
سوے مقتل ہی سہی راہ گزر کوئی تو ہے
خود بخود ہاتھ گریباں کی طرف اٹھتے ہیں
سرسراتی سی ہواؤں میں خبر کوئی تو ہے

الٹ دیا ہے زمیں پر کہ پیاس سے کم تھا
وہ جام جم بھی جو مستوں کو خاتحانہ ملا

یوں تو علی سردار جعفری صاحب نے ان کے مجموعۂ کلام "نگاہ" کے دیباچے میں بطریقِ احسن ان کا تعارف کرایا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے یہ چند الفاظ اختر شناسی میں کوئی اضافہ بنتے بھی ہیں یا نہیں مگر میں نے کہیں کسی مبالغے سے کام نہیں لیا ہے۔ رفیقوں کی غزل دشمنی کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے گواہ بمبئی، دلی، لکھنؤ غرضیکہ ہندستان، پاکستان ہر جگہ موجود ہیں۔ نوجوانوں کے لیے البتہ یہ ایک خبر ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

اختر سعید خاں۔ اسیرِ زلفِ شبِ مالوہ

اس دکھی ماحول میں ایک "سکونِ لمحہ حاصل" بھی بہت غنیمت ہے اور ایک "اہل دل" اور "روشن دماغ" شاعر اسی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اختر سعید خاں ایسے ہی ایک "سکون لمحہ حاصل" کی جستجو میں شعری سفر کر رہے ہیں جن کے راستے میں "منزلیں ہی منزلیں" ہیں وہ ایک "منزل" پر پہنچ کر دوسری طرف چل پڑے ہیں۔ "نگاہ" ان کے کلام کا مجموعہ ہے بلکہ "انتخاب" ہے۔ (۱۰۸) غزلیں اس میں شامل ہیں اور ۸۲ متفرق اشعار۔

پہلی ہی نظم ایک نعت ہے۔ حج کے لیے گئے ہوئے تھے اور وہاں "درِ رسولؐ پر" یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

مزہ تو جب ہے کہ میں تجھ سے مانگ لوں تجھ کو
پھر اپنے جذبۂ گستاخ کی سزا مانگوں

شعر چونکا دیتا ہے اور قاری کچھ گم سا ہو جاتا ہے۔ انگریزی کے ایک شاعر نے کہا تھا کہ جب خدا اپنی تخلیق کو مختلف اوصاف تقسیم کر رہا تھا، کسی کو عقل و فہم دی، کسی کو حسن دیا، کسی کو دولت و ثروت دی، ایسے میں شاعر کہیں پائیں باغ میں محوِ تفریح تھا۔ جب شاعر خدا کے حضور میں آیا تب تک خدا سب کچھ بانٹ چکا تھا۔ اب اس کے پاس دینے کو رہا کچھ نہ تھا، مگر کچھ تو دینا ہی تھا۔ خدا نے کہا "میرے پاس کچھ رہا نہیں ہے۔ میں اپنے آپ کو تیرے سپرد کرتا ہوں"، یہی تو وہ منزل ہے جہاں شاعر کے قلم سے نکلا ہوا کلام "تلمیذِ رحمانی" کی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

اختر سعید اپنے "حسنِ طلب" کو "جذبۂ گستاخ" کہہ کر اپنی معصومیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

ان کے اس شعر سے ذہن تامل کے ایک شاعر مانکاواچگر کے اس قسم کے ایک شعر کی طرف رجوع ہوتا ہے جہاں شاعر کہتا ہے "او خدا! میں نے اپنے آپ کو تیرے سپرد کر دیا اور معاوضہ میں تجھے پا لیا۔ بتا ہم دونوں میں زیادہ ہوشیار کون ہے!"

اختر سعید کے زیر نظر کلام میں ،، کانٹے ،، اور ،، لمحے ،، دو علامتیں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں ۔

اختر یہ تیرے پاؤں کے کانٹے نئے نہیں
کانٹوں سے کھیلتا ہوا چھالا عجیب ہے

اے دشتِ جنوں گواہ رہنا
کانٹے ہیں اور اِک برہنہ پا ہے

چمن آرائی تھی جس گل کا شیوہ
میری راہوں میں کانٹے بو گیا ہے

کب بادِ صبا آئی کب گل کا پیام آیا
ٹوٹا جو کوئی چھالا کانٹوں کا سلام آیا

کانٹوں کی خلش سے ہر لحظہ پھولوں کی طلب بڑھتی ہی گئی
صحرا سے گزر کر دیوانہ نزدیکِ گلستاں آ ہی گیا

دیکھیے ،، کانٹے ،، کتنے روپ میں اختر کے کلام میں آتے ہیں ۔ زندگی کے سفر میں پیر کے چھالے کانٹوں سے کھیلتے ہوئے ہیں ۔ کانٹوں کے وجود کی شہادت میں وہ سارے دشتِ جنوں کو پیش کرتے ہیں اور جنونِ عشق کے بغیر جوشِ سفر ممکن نہیں ۔

وہ پھول جن کے ذمّہ چمن آرائی تھی وہی راہ میں کانٹے بو گئے ۔

پھر کانٹوں کی خلش سے پھولوں کی طلب اور بھی بڑھ جاتی ہے اور شاعر تلاش وجستجو کے صحرا سے گزر کر منزلِ مقصود کے گلستاں کے نزدیک آ ہی گیا ۔ یہاں کانٹے حوصلہ شکن نہیں بلکہ ہمت افزا بن جاتے ہیں ۔

اختر ،، لمحوں ،، سے کیوں کر کھیلتے ہیں ؟ ملاحظہ فرمایئے ۔

مبارک خضر کو لطفِ حیاتِ جاوداں اختر
محبت کی حیاتِ مختصر کچھ اور ہوتی ہے
پلک جھپکتے ہی ہر لمحہ نقشِ ماضی تھا
سکونِ لمحہ حاصل مجھے مِلا ہی نہیں
پروردگار حوصلۂ یک گناہ دے
دم گھٹ رہا ہے عشق کو توفیقِ آہ دے

اختر سعید خاں

اجل کے سینے میں چبھ رہا ہے خزاں کے دل میں کھٹک رہا ہے
وہ اک لمحہ اڑا لیا ہے جو ہم نے کھلتی ہوئی کلی سے

وہ زندگی تھی، آپ تھے یا کوئی خواب تھا
جو کچھ تھا ایک لمحے کو بس سامنا ہوا
وہ ایک لمحہ جو میری گرفت نہ آ سکا
لیے حیاتِ جاوداں قریب سے گزر گیا

دیکھیے "لمحہ" اختر سعید کی فنکارانہ چابک دستی سے کیا کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ خضر کی بے خبر حیات جاوداں کے مقابلہ میں محبت کا ایک لمحہ کتنا خوش گوار ہوتا ہے "سکون لمحہ حاصل" کی آرزو کیسے کشمکش حصول تمنا کے لیے حوصلے عطا کرتی ہے۔ کلی چٹکنے کا ایک لمحہ موت اور خزاں کے لیے کس قدر حوصلہ شکن ہوتا ہے؟

اور پھر ایک لمحے کا سامنا کس کا تھا۔ زندگی کا، محبوب کا یا پھر ان ہی کا کوئی سپنا تھا۔ ممکن ہے۔ یہی وہ لمحہ بھی ہو جو موسیٰ کو طور پر میسر ہوا تھا۔

اختر کے پاس غم دل اور غم جہاں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ فرد اپنے ماحول اور اپنی کائنات کا ایک ایسا جزو ہے جہاں جزو سے کل کی تکمیل ہوتی ہے اور کل جزو کی ساری کیفیات پر حاوی ہوتا ہے۔

یہ جو ملتی ہے ترے غم سے غمِ دہر کی شکل
دل نے تصویر سے تصویر اتاری ہوگی

غمِ جہاں میں غمِ دل شمار ہو کے رہا
یہ فیصلہ بھی سرِ کوئے یار ہو کے رہا

فکر و فن جاگ اٹھے، لوح و قلم جاگ اٹھے
زندگی جن سے عبارت ہے وہ غم جاگ اٹھے

اس غم کا مداوا اختر سعید کے پاس "تمنا" ہے یہاں ان کا فکری رشتہ غالب کے "نشاط آرزو" سے مل جاتا ہے۔

نیرنگیٔ نشاطِ تمنا عجیب ہے
کچھ شام سے قفس میں اجالا عجیب ہے
ہر خواب اعتبار شکستوں سے چور ہے
دل میں مگر غرورِ تمنا عجیب ہے

اک نہ اک عنوانِ شرحِ آرزو کرتے رہو   کچھ زمانے کی کچھ اپنی گفتگو کرتے رہو

چند ذرّے دل کے رقصاں ہیں فضاؤں میں ابھی
لاؤ ان ذرّوں میں حشرِ آرزو برپا کریں

اگر شاعر، قفس کو اپنا مقدّر مان لے، قنوطیت کا شکار ہو جائے اور یہی قنوطیت زندگی کی طرف اس کا رویہ بن جائے تو وہ "فانی" ہوگا۔

اگر اسے اسی "قفس" کی تیلیوں سے کچھ امید کا "نور" چھنتا نظر آئے اور اس لمحے کے اندر "حسرتِ پرواز" جاگ اٹھے تو وہ "فراق" کی منزل میں داخل ہوگا۔

اور اگر شاعر نے قفس میں جو "طرزِ فغاں" ایجاد کی ہے وہ باہر جہدِ حیات میں مصروف انسانوں کا "مارچنگ سانگ" بن جائے تو پھر وہ فیض کی سرحدوں میں پہنچ جائے گا۔

اختر فراق سے شروع ہوتے ہیں اور فیض کے دور میں اپنے شعری شباب پر پہنچتے ہیں۔ اس لیے ان کے تیور کچھ ایسے ہیں۔

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی

یہ شمعِ رہ گزر ہے اس کو جلنے دو ہواؤں میں
تہِ دامن نہیں رکھتے چراغِ فکر و فن اختر

جھونکوں میں ہوا کے جل رہے ہیں
شمعِ سرِ راہ گزار ہیں ہم

چمن میں جرم ٹھہرایا گیا تھا مسکرانے کو
مگر پھولوں نے ہنس ہنس کر بدل ڈالا زمانے کو

بلائے تیرہ شبی کا جواب لے آئے
بجھے چراغ تو ہم آفتاب لے آئے

میں وہ رہرو ہوں کہ ہر موڑ پہ منزل کی طرف
پہلے میں بڑھتا ہوں اور راہنما میرے بعد

لو موت کے سنگین پہرے سے اک عزمِ جواں ٹکرا ہی گیا
مر مر کے بالآخر انسان کو جینے کا سلیقہ آ ہی گیا

ملک آزاد تو ہوا، لیکن وہ "سکونِ لمحۂ حاصل" جس کی تلاش تھی ابھی نظروں سے اوجھل ہے۔ اختر کو سینے ہ

میں نے سنا تھا سورج نکلے ڈھل جاتی ہے رات
میں نے دیکھا صبح بھی نکلی رات کی پہرے دار

یہ دن بھی صبحِ حشر سے نہیں ہے کم کسی طرح
مگر جو ہم نے کاٹ دی وہ رات ہی کچھ اور تھی

سحر ہوئی تو ماحصل یہ تھا شبِ اُمید کا
جو اعتبار تھا گیا، جو انتظار تھا رہا

ہر شاخ پہ کانٹے تھے نگراں، ہر موڑ پہ گلچیں تھے لیکن
کلیوں نے چٹکنا سیکھ لیا، پھولوں کو مہکنا آ ہی گیا

ادھر سے بھی گزر جائے بہارِ زندگی اک دن
دیارِ ہند میں آباد ویرانے ہزاروں ہیں

جب بھی بڑھتا ہے اندھیرا سوئے دل
یہ چراغ اور بھی لَو دیتا ہے

ہمصفیرانِ چمن مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہوگی

یہ زمانہ مجھے جب زخم نیا دیتا ہے
ایک چراغ اور بھی سینے میں جلا دیتا ہے

حوصلے دل کے بہت عشق بڑھا دیتا ہے
جو بھی غم دیتا ہے طاقت سے سوا دیتا ہے

یہ "رنِ عشق" نہیں "عشقِ منزل" ہے جو انسان کو سکونِ ممکن الحصول کی طرف بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

اختر دیکھتے ہیں کہ ان کے ہم وطن کچھ سوئے سوئے سے ہیں۔ کہیں وہ ایسی

منزل میں تو نہیں جہاں وہ غم و نا آسودگی کے عادی ہو گئے ہیں، جہاں افلاس کی خو نے انھیں گراوٹ کی اس منزل پر پہنچا دیا ہے جہاں پریم چند کی کہانی "کفن" کے کردار پہنچ گئے تھے۔

پھر اختر کے سینے میں نشاطِ آرزو انگڑائی لیتی ہے اور وہ اپنے عزیز وطن سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

تو گلشنِ خوابیدہ ہے ویرانہ نہیں ہے
بلندی سے ہماری سمت ہنس کر دیکھنے والو
بلندی خود ہمارے سامنے خم ہے جہاں ہم ہیں

اختر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی زبان میں عصری حقیقتوں کو فنکارانہ انداز سے بیان کرنے کے گُر سے واقف ہیں اور غزل کو یہی تو ترقی پسند دور کی دین ہے۔

پھر غزل کے اپنے رومانی تیور بھی ہیں جو غزل کو اس کی روایتی عظمت دیتے ہیں۔ یہاں بھی اختر اپنا مقام رکھتے ہیں یہ شعر دیکھیے۔

آثار اچھے نہیں شبِ ہجر
دل کو کچھ قرار سا ہے

قریب و دور کچھ پرچھائیاں سی ساتھ چلتی ہیں
نہ جانے یہ تمھاری یاد کے سائے ہیں یا تم ہو

پتا یوں تو شگفتِ گل سے بھی ملتا ہے موسم کا
جو دیوانے سے ملتی ہے خبر کچھ اور ہوتی ہے

ہوئی جو صبح تو اشکوں سے جگمگا اٹھی
جو آئی شام تو یادوں سے مشکبار گئی

کس کے ہاتھوں بک جائے یہ کن داموں معلوم نہیں
دل کی قیمت دونوں عالم، دل کی قیمت ایک نظر

مدت سے لاپتا ہے خدا جانے کیا ہوا
پھرتا تھا ایک شخص تمھیں پوچھتا ہوا

شاید چمن میں جی نہ لگے لوٹ آؤں میں
صیاد رکھ قفس کا ابھی در کھلا ہوا

ہوئے جب وہ پرسانِ غم کھو گئے ہم
جہاں جاگنا تھا وہیں سو گئے ہم

کچھ تیرے ساتھ زندگی گزری
کچھ تیری یاد میں گزاری ہے

بچا بھی لائیں ہم جلوہ گاہِ جاناں سے
یہ چوٹ کھائی ہوئی زندگی کہاں گزرے

غرض یہ ہیں اختر سعید خاں، بھوپال کی جان اور اردو کی آبرو ہیں۔ ہر وہ رنگ جو حسین ہے وہ ان کی تصویر میں محفوظ ہے ؎

رنگِ گل، رنگِ بتاں، رنگِ جبینِ محنت
جو حسیں رنگ ہے شامل مری تصویر میں ہے

ڈاکٹر قمر رئیس

اختر شناسی کے چند پہلو

آزادی کے بعد اردو غزل کا نشاۃِ ثانیہ ایسے جلال و جمال کے ساتھ ہرگز سامنے نہ آتا اگر ترقی پسند شعرا کی تخلیقی اور فکری صلاحیتیں اس مہم میں شامل نہ ہوتیں۔ فیض، مجاز، جذبی، مجروح، پرویز شاہدی، حسن نعیم، اختر سعید خاں، احمد ندیم قاسمی، ابن انشا، قتیل شفائی، فارغ بخاری، احمد فراز اور دوسرے ان گنت شعرا جو اس تحریک سے وابستہ تھے غزل کو احساس و شعور کی ایک نئی سمت دینے میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جنھوں نے نئی غزل میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے اور صنفِ غزل کی حرمت کو زندہ رکھا ہے۔

اختر سعید خاں نے بھی غزل کی نوآبادکاری میں نمایاں حصہ لیا ہے اور ایسے بلند معیار کے تیکھے شعر کہے جو زبانِ زد عام ہوگئے۔ ان کی تخلیقی ذہانت پر کون شبہ کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ؎

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی
ہمصفیرانِ چمن مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہوگی

اس میں دو رائیں نہیں کہ اختر سعید خاں اپنی ذہنی اور فنّی تربیت کے لحاظ سے کلاسیکی بلکہ نوکلاسیکی مزاج کے شاعر ہیں۔ الفاظ کا دروبست، تراکیب کی چستی اور معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ وہ کلاسیکی استعاراتی نظام کی ریکھا بھی پار نہیں کرتے۔ صیاد و قفس، مرغ و چمن، بہار و خزاں، برق و آشیاں، بت خانہ و حرم، شمشیر و مقتل، اور اس قبیل کی دوسری علامتیں کثرت سے ان کے اشعار میں ملتی ہیں لیکن اس حصار میں رہنے کے باوجود ان کے اشعار میں روحِ عصر کا افسانہ و افسوں صاف نظر آتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے کربناک ماحول اور وسیع تر عوامی زندگی کے سوز و درد کو اپنے اسی مانوس اور نرم لہجہ میں پیش کرتے ہیں۔ وہ غزل کی ہمہ گیر مقبولیت کے اس رمز سے آشنا ہیں کہ اس میں صحیفہ حیات کو حدیثِ دل بناکر پیش کیا جاتا ہے کہتے ہیں۔

بند رکھو گے دریچے دل کے یارو کب تلک
کوئی دستک دے رہا ہے اُٹھ کے دیکھو تو سہی

خاک ہو کر تیری راہوں میں بکھر جاؤں گا میں
زندگی تجھ سے وہی عہدِ وفا ہے آج بھی

جلتے رہے رات بھر، ہجر میں جس کے چراغ
صبح کو وہ روشنی، اہلِ سحر کیا ہوئی

گزشتہ پینتالیس سال میں کاروانِ بہار، پُرخار وادیوں کے جن پیچ وخم سے گزرا ہے اس کے جانگداز نقوش اختر سعید خاں کے اشعار میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔

کبھی کبھی جب وہ زندگی کے تلخ و شیریں تجربات پر گہرائی سے غور کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو ان کے لہجہ میں فکر و تامل کا بڑا شگفتہ اور موثر انداز ابھر آتا ہے۔

کیا فضائے صبحِ خنداں کیا سوادِ شامِ غم
جس طرف دیکھا کیا میں دیر تک ہنستا رہا

ان گنت صدیوں سے ہوں آوارۂ دشتِ حیات
اس خرابے سے مگر رشتہ نیا ہے آج بھی

کچھ نہ نکلا دل میں داغِ حسرتِ دل کے سوا
ہائے کیا کیا تہمتیں تھیں آدمی کے نام پر

ہر تحریک کی طرح ترقی پسند تحریک کا ایک انتہا پسندانہ دور بھی رہا ہے جب کچھ ایسے شاعروں نے جو کمیونسٹ پارٹی کے فعال رکن تھے شاعری کو ہنگامی موضوعات کا تابع کر دیا۔ رجائیت، حوصلہ مندی اور انقلابی بلند آہنگی جیسی صفات شعری اقدار قرار پائیں۔ بعض اعلا تخلیقی صلاحیت رکھنے والے شاعر سیاسی فکر سے راست شعری اظہار کو نبھالے گئے اور انھوں نے اپنا ایک منفرد اسلوب بھی ڈھال لیا۔ مثلاً مخدوم، فیض، سردار جعفری، مجروح اور کیفی اعظمی۔ لیکن ان کے مقلدین نے (جن میں سے بیشتر بعد میں جدیدیت کے قافلے میں شامل ہو گئے) ''انقلابی شاعری'' کے نام پر خوب خوب طبع آزمائی کی اور یہی وہ خام جذباتی شاعری تھی جس کا نام لے کر بعد میں ترقی پسند شاعری کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔

تعجب ہے کہ اختر سعید خاں کا شعری اسلوب اس افراط و تفریط سے بچا رہا۔ ان کے یہاں سکہ بند ترقی پسندی کے زیرِ اثر اگر کچھ اشعار ملتے بھی ہیں تو ان کا معیار

بھی اس سے کم نہیں ہو پاتا۔

مجھے اسیر بھی کرلیں جو آج اہلِ چمن
کلی کلی کی بغاوت دبائیں گے کیا کیا

لیکن اس تحریک نے کائنات اور فطرت کے ہمہ گیر تناظر میں انسانی سماج اور خود انسانیت کی نجات کے لیے جو ایک وسیع فکری نظام دیا تھا، انسان کی اخلاقی فتح مندی پر جو ایمان بخشا تھا، اختر سعید نے اپنی شاعری میں اس سے آزادانہ طور پر استفادہ کیا ہے۔ اس کے ثبوت میں یوں تو بہت سے اشعار نقل کیے جا سکتے ہیں لیکن میں ایک مسلسل غزل کے چند اشعار نقل کروں گا۔ ان اشعار میں انسان کی مقدرت اور مجبوریوں کے المناک تضاد کو شاعرانہ حسن اور برجستگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اگر ہستی مری موجِ صبا ہے
تو غنچہ دل کا کیوں مرجھا رہا ہے
اگر مجھ کو ملی ہے خوئے شبنم
تو سینے سے دھواں کیوں اٹھ رہا ہے
اگر ہے اعتبارِ نغمہ مجھ سے
تو یہ کیا محشرِ آہ و بکا ہے
محیطِ عرش ہے پرواز میری
تو پھر یہ پاؤں کی زنجیر کیا ہے
اگر میں پا گیا ہوں رازِ فطرت
زمانہ مجھ سے کیوں بگڑا ہوا ہے
نہ بخشوں کس لیے زندان و نمک کو
یہی تو میری محنت کا صلا ہے
جگاؤں کیوں نہ صبحِ آرزو کو
یہی تو شامِ غم کا آسرا ہے

اس پوری غزل میں واحد متکلم کی شناخت بتدریج دکھی انسانیت کے پھیلے ہوئے سمندر میں لہروں کی طرح ڈوبتی ابھرتی نظر آتی ہے۔

اختر سعید خاں کے اشعار میں ہم عصر زندگی کے بحران کا ادراک و عرفان کہیں کہیں بڑے نازک تخیلی پیکروں میں سامنے آتا ہے۔ مثلاً دشت۔ برہنہ پائی، کانٹے سناٹا، انسانی اقدار کی بربادی وغیرہ مثلاً

بجھ گئے ایک ایک کرکے سب عقیدوں کے چراغ
اے زمانے کی ہوا اب یہ بتا ہم کیا کریں

زندگی کیا ایک سناٹا تھا پچھلی رات کا
شمعیں گل ہوتی رہیں دل سے دھواں اٹھتا رہا

طوالت کے خوف سے میں یہاں ان کی شاعری کے صرف ایک کلیدی پیکر کا ذکر کروں گا۔ اور وہ ہے خواب۔ خواب ان کی شاعری میں کسی بہشت خیالی (UTOPIA) کی علامت نہیں۔ بلکہ عام انسانوں کی معصوم آرزومندیوں کی تجسیم ہے جو بار بار ان کی نیند اور آنکھوں میں سایہ فگن ہوتا ہے۔ اکثر یہ عملی زندگی میں ریزہ ریزہ ہوکر بھی شاعر کے سیلِ آرزو میں رقص کرتا ہے۔

پل رہا ہو لائقِ تعبیر شاید کوئی خواب
میری ان اجڑی ہوئی آنکھوں میں جھانکو تو سہی

ہر خوابِ اعتبار شکستوں سے چور ہے
دل میں مگر غرورِ تمنا عجیب ہے

یہ خواب دوسرے اشعار میں انسانی خواہشوں کا زیادہ پہلودار استعارہ بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایسے خواب ہیں جو ایک جمہوری نظام میں بھی ٹھوکریں کھاتے نظر آتے ہیں اور زندگی کی سرگرانی اور زیاں کا احساس بڑھاتے ہیں۔

سلگتے خوابوں کی بستی ہے رہگزارِ حیات
یہاں دھواں ہی دھواں ہے ذرا سنبھل کے چلو

کون دیتا ہے یہاں خوابِ جنوں کی تعبیر
خواب ہم اپنے سنائیں تو سنائیں کس کو

زندگی چھین لے بخشی ہوئی دولت اپنی
تو نے خوابوں کے سوا مجھ کو دیا بھی کیا ہے

ایک شعر ہے۔

ایسے ناداں نہیں راتوں میں بھٹکنے والے
جاگتی آنکھوں میں خورشیدِ سحر کوئی تو ہے

یہ فیض کی مشہور غزل کے ایک شعر کی یاد دلاتا ہے۔

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پند گرو۔ راہگزر تو دیکھو

فیض کے شعر کی دلکشی اپنی جگہ۔ لیکن یہاں رہگزر کی اشاریت ابہام کی حدوں کو چھو لیتی ہے۔ اگر اردو غزل کی روایت پر نظر رکھیں تو یہ صرف عشق کی راہ کہلائے گی۔

ناصح اور پندگر اسی راہ سے دور رہنے کی تلقین کرتے آئے ہیں۔ اختر سعید خاں کے شعری علامتے فضا اسے سے مختلف اور زیادہ EVOCATIVE ہے۔ قاری کے سامنے غلامی اور جبر و بیداد کے اندھیروں میں بھٹکنے والے ان انسانوں کی شبیہہ ابھر آتی ہے جو اپنی جاگتی آنکھوں میں خورشیدِ درخشاں کے خواب بسائے ہیں جو ان کا آخری سہارا ہیں۔

لیکن گزشتہ چند برسوں میں عالمی سطح پر سوشلسٹ نظام کے انہدام سے ترقی پسند حلقوں میں حزن و یاس کی جو لہر آئی ہے اس نے اختر سعید خاں کے مقدس خوابوں کو بھی دھندلا دیا ہے۔ اور وہ بڑے کرب سے سوچنے لگے ہیں۔

کھڑا ہوں میں اختر یہ کس موڑ پر
سفر کیا ہوا، ہم سفر کیا ہوئے

اب ان کے خوابوں کی کیفیت کچھ یوں ہے۔

یہ کیسا خواب ہے پچھلے پہر کے سناٹو!
بکھر گیا ہے اور آنکھوں سے چھوٹتا بھی نہیں

خواب بکھر کے رہ گئے نیند اچٹ کے رہ گئی
ایک اداس شام پھر دل سے لپٹ کے رہ گئی

وہ جانتے ہیں کہ ہر عہد میں خواب دیکھنے والوں کا یہی مقدر رہا ہے لیکن اس سچائی سے انکار بھی ان کے بس کا نہیں کہ حساس اور دردمند انسانوں کی آنکھوں کا خواب سے وہی رشتہ ہے جو روشنی سے ہے۔ جو فطرت کے بے اماں حسن سے ہے۔

اختر سعید خاں کی غزل میں حسن و عشق کی نشاط آگیں کیفیات اور واردات بھی بڑے انوکھے اور والہانہ انداز میں سامنے آتی ہیں۔ میر کی طرح وہ بھی ایک چوٹ کھایا ہوا دل رکھتے ہیں لیکن اس غم کے بے پایاں اندھیروں میں ڈوب نہیں جاتے۔ ان کے تصورِ عشق کی وضاحت کے لیے ایک علاحدہ مضمون درکار ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اس بلاخیز جذبہ نے ان کے احساس و تخیل کو ہمیشہ ایک سماجی کیفیت سے ہمکنار رکھا ہے۔ ان کی تہذیب کی ہے اور ایسے شعر کہلائے ہیں جو دائمی مسرت بخشتے ہیں۔

قریب و دور کچھ پرچھائیاں سی ساتھ چلتی ہیں
نہ جانے یہ تمھاری یاد کے سایے ہیں، یا تم ہو

تری ان ہنستی ہوئی آنکھوں سے نسبت تھی جسے
میری پلکوں پہ وہ آنسو عمر بھر ٹھہرا رہا

زندگی کیا ایک سناٹا تھا پچھلی رات کا
شمعیں گل ہوتی رہیں دل سے دھواں اُٹھتا رہا

دھوپ ہی دھوپ نہ تھی دشتِ جنوں میں پہلے
کچھ گھنے پیڑ بھی تھے۔ راہ میں سایا بھی تھا

ہم نے ساری زندگی اک آرزو میں کاٹ دی
فرض کیجیے کچھ نہیں کھویا مگر پایا بھی کیا

اک آگ سی تھی زیرِ قدم راہ میں ورنہ
دم لینے کو ہم بھی ترے کوچے میں ٹھہرے

عشق میں ترکِ رسمِ جنوں پر لوگ نہ دیں الزام بہت
ان کے بھی کچھ اپنے غم تھے ہم کو بھی تھے کام بہت
سارے قصے مہر و وفا کے دل سے محو ہوئے لیکن
جب بھی کوئی کسی سے بچھڑا یاد آیا اک نام بہت

بدل چکی رُت مگر ابھی تک فضا میں کچھ دھوپ چھاؤں سی ہے
حسین مکھڑوں کی چاندنی سے۔ سیاہ زلفوں کی برہمی سے

افسوس اس کا ہے کہ ایسے خوبصورت اور جانگداز شعر کہنے والے فنکار نے شاعری کو ہمیشہ ایک ذیلی یا CASUAL مشغلہ کے طور پر برتا۔ جبکہ یہ فنِ لطیف زیادہ توجہ، انہماک اور پیہم ریاض کا مطالبہ کرتا تھا۔

اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اختر سعید خاں کی غزل اپنی شگفتگی، تخیلی تازگی اور فنی رچاؤ کے باعث معاصر غزل کے سرمایہ میں ایک مستقل اضافہ ہے اور بقول سردار جعفری یہ قدیم اور جدید غزل کا امتزاج ایک نئی جمالیاتی کیفیت پیدا کرتا ہے اور روح کے لیے انبساط کی ایک نئی سطح تلاش کرتا ہے۔

یوسف ناظم

"نگاہ"

جو کم از نگاہ نہیں

مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے اپنے دوسرے کاموں کے علاوہ ایک اشاعتی منصوبہ بنایا ہے اور اتفاق سے اچھی کتابیں شائع کر رہی ہے۔ اب جو کتاب میرے ہاتھ لگی "نگاہ" وہ تو اتنی خوبصورت ہے (اندرونی و بیرونی حسن و جمال کے ساتھ) کہ اس پر نگاہ نہیں ٹھہرتی ہے۔ شہناز عمرانی کا بنایا ہوا سرورق، کم سے کم چار منٹ تک تو آپ کو روکے ہی رکھتا ہے۔ اس کے بعد آپ کتاب کھولتے ہیں اور ایسا محسوس کرتے ہیں۔ کیا بتاؤں کیا محسوس کرتے ہیں۔ وہ جو غالب کی غزل ہے نا جس کے قافیے میں منظر، خاور اور ردیف ہے کھلا۔ بس یوں سمجھیے وہی غزل کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ میری عمر اگر ۲۰-۲۵ سال کم ہوتی تو شاید میں اس مجموعۂ کلام کی جلد کو 'بند قبا' ہی کہتا۔ غزلوں کی شاعری کے لیے یہ لفظ زیب بھی دیتا ہے۔

اختر سعید خاں اردو کے ان ۴،۶ شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کو پھلنے پھولنے تو دیا لیکن 'پھیلنے' نہیں دیا۔ آج سے ۴۰، ۴۵ سال پہلے تک فضا اچھی تھی۔ ہوا نرم و سبک تھی اور بہت سی چیزیں ہوا کے دوش پر دور دور سفر کر لیتی تھیں۔ اب ہوا میں آلودگی ہے اس لیے 'شاعری' کو پھیلانے کے لیے باضابطہ بندوبست کرنا پڑتا ہے اور اس 'بندوبست' میں بہت سی باتیں 'بہ رنگ دگر' قسم کی آجاتی ہیں۔ اختر سعید خاں کو یہ سب کچھ کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ یا ہو سکتا ہے ان کی طبیعت ہی ادھر نہ آئی ہو۔ رسائل میں وہ کم چھپے۔ مشاعروں سے بہت زیادہ 'چھپے'۔ طویل عرصے سے شاعری کر رہے ہیں لیکن اب کوئی ۳۰، ۴۰ سال بعد اپنے مجموعۂ کلام کی ترتیب و اشاعت کا انھیں خیال آیا۔ وہ بھی دوستوں کے سمجھانے 'بجھانے' پر۔ وکالت ہے ہی بڑا ظالم پیشہ۔ اگر وہ اس وقت بھی اپنا مجموعہ نہ چھپواتے تو کوئی ان کا کیا بگاڑ لیتا، لیکن اتنے سارے اچھے عمدہ اور نفیس اشعار (جو اس مجموعے میں موجود ہیں) ان کے کسی موکل کے خارج شدہ مقدمے کی مثل کی طرح کہیں پڑے رہتے۔ کہا گیا ہے کہ وکیلوں کو فیصلے سننے نہیں چاہئیں۔ کبھی کبھی خود بھی کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ "نگاہ" کی اشاعت نہایت معقول فیصلہ ہے۔ اور یہ وہ 'نگاہ' نہیں ہے جو 'کم از نگاہ' ہوتی ہے۔ یہ نگاہ صحیح انداز ہے۔

اختر سعید خاں کی باقاعدہ شعری تربیت ہوئی ہے۔ وہ فن شاعری کے رموز و نکات سے واقف ہیں (واقف تو بہت سے شاعر ہوتے ہیں لیکن ان سے روگردانی میں انھیں مزا آتا ہے ۔) اپنی غزل کو انھوں نے بڑے ڈھنگ سے سجایا ہے۔ اس کی آرایش تو نہیں کی۔ لیکن اسے آلایشوں سے بہر حال بچایا اور جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے، انھوں نے ۱۹۳۶ء کے بعد کے رجحانات کو تنگنائے غزل میں جگہ دے کر اسے سب کے لیے قابل قبول بنایا۔

ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے جعفری صاحب نے اپنے دیباچے میں اگر یہ لکھا ہے کہ اختر سعید خاں کا موضوع سخن پوری کتاب زندگی ہے تو کیا غلط لکھا ہے اس کتاب کے آخری صفحے پر ایک شعر درج ہے جو واقعی کتاب کو خاتمہ بالخیر کی منزل پر پہنچاتا ہے۔

شبنمی یادیں، سلگتے خواب، لو دیتے خیال
دل کے سب قصے تری چاہت کا عنوان ہو گئے

اور مجموعہ کا پہلا شعر یعنی پہلی غزل کا مطلع:

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہو گی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہو گی

اس رجائیت کی نشان دہی کرتا ہے جس کے سہارے انسان زندگی کار جہاں دراز، کے سفر پر رواں دواں ہے:

ہر خوابِ اعتبار شکستوں سے چور ہے
دل میں مگر غرورِ تمنا عجیب ہے
سارا بدن ہے دھوپ میں جھلسا ہوا مگر
دل پر جو پڑ رہا ہے وہ سایہ عجیب ہے

لوگ ڈھونڈا کیے آئینوں میں چہرے اپنے
ہم نے پتھر میں بھی جھانکا تو صنم جاگ اٹھے
آبلہ پا سہی لیکن مری رفتار تو دیکھ
گرد میں سوئے ہوئے نقشِ قدم جاگ اٹھے

اختر سعید خاں حقیقت، خواب اور امید کے شاعر ہیں۔ افسردگی میں آسودگی کا عکس دیکھتے ہیں۔ ان کے یہاں آبلہ پائی سفر کی دعوت دیتی ہے۔ غم خوشی کا پیش خیمہ ہے۔ کہیں کہیں مایوسی کی جھلک ضرور ہے لیکن اسے وہ کھیل کا حصہ (PART OF THE GAME) سمجھتے ہیں۔ خواب تو ان کے یہاں ہیں لیکن حقیقت اور امید کے رنگ زیادہ نکھرے ہوئے ہیں۔

شاعر نے جہاں 'غم روزگار' کی دھوپ کھائی ہے وہیں 'غم جاناں' کے سایے میں بھی سر چھپایا ہے۔ خالص غزل کے شعر کہنا اختر سعید خاں کے لیے غالباً زیادہ آسان ہے۔ یہ دو شعر دیکھیے۔

اختر سعید خاں

قریب و دور کچھ پرچھائیاں سی ساتھ چلتی ہیں
نہ جانے یہ تمھاری یاد کے سایے ہیں یا تم ہو

بدل جاتے ہیں چہرے نام تو بدلا نہیں کرتے
تم اختر کو نہیں پہچانتے، اچھا تو جانے دو

لفظ "تو" کو باندھنا اور برتنا مشکل تو نہیں لیکن اس کے لیے سلیقہ ضرور چاہیے۔ اختر سعید خاں تو اس لفظ کو ردیف بنا کر نباہ لے جاتے ہیں۔

سرسری گزرو نہ شہرِ دل سے نا پرسانِ غم
بات بھی کرنی مجھے آتی ہے پوچھو تو سہی
بند رکھو گے دریچے دل کے یارو کب تلک
کوئی دستک دے رہا ہے اٹھ کے دیکھو تو سہی

میں سمجھا تھا اختر سعید خاں کی 'نگاہ' تیز ہے معلوم ہوا کان بھی تیز ہیں لیکن میں قائل ان کی، نگاہ، کا ہوں جو یقیناً دور رس ہو گی۔

مظفر حنفی

اختر بھائی

بھوپال اور اس کے قرب و جوار میں اختر بھائی (اختر سعید خاں) کی مقبولیت اور احترام کا عالم گزشتہ چار دہائیوں سے تقریباً اسی منزل پر ہے جہاں ہندو پاک کی ادبی دنیا میں مرحوم بنّے بھائی (سجاد ظہیر) فائز تھے، عوام میں سیکڑوں کے نام اختر اور شاعروں میں درجنوں کے تخلص اختر ہیں لیکن اس علاقے میں جب کسی کی زبان سے اختر بھائی کے الفاظ ادا ہوتے ہیں تو مراد اختر سعید خاں سے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے خلوص و عقیدت کا یہ عمل یک طرفہ نہیں ہے اختر سعید خاں اپنی ذات سے نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کی عملی تصویر بھی ہیں اور دلنوازی، حلم و ایثار، انسیت اور ہمدردی کا پیکر بھی۔ وکالت جیسے کل وقتی پیشے سے متعلق رہ کر وہ بھوپال کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی روح رواں بھی ہیں۔ حلقہ دانشوران، انجمن ترقی پسند مصنفین بزم فنکار، انجمن ترقی اردو اور ایسی تمام دیگر ادبی انجمنوں کے جلسوں میں مسلسل شرکت کرنا اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ مختلف تنظیمی امور میں دامے، درمے اور سخنے معاونت کرتے رہنا اختر سعید خاں کا محبوب مشغلہ ہے۔

اختر سعید خاں جاگیردارانہ معاشرے کے پروردہ ہیں چنانچہ ان کی نفاست پسندی، جمالیاتی ذوق، رکھ رکھاؤ اور شائستگی میں آج بھی ریاست بھوپال کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے والد حامد سعید خاں مرحوم خود بھی شاعر تھے اور شاعر نواز بھی، چنانچہ مشاہیر ادب اکثر ان کے ہاں مہمان ہوتے اور شعر و ادب کی محفلیں اکثر آراستہ ہوتیں، یہ سلسلہ اختر سعید خاں نے بھی جاری رکھا۔ اس ماحول نے انھیں کلاسیکی ادب کا سچا اور نکھرا ہوا شعور عطا کیا۔ جس کا عکس مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔

جرم کی طرح محبت کو چھپا رکھا ہے
کہیں ایسا نہ ہو تم نے مجھے دل سے بھلایا ہو
دل میں نہیں اک بوند لہو کی، آنکھ سے آنسو ٹپکے کیا
چھڑی ہوئی تھیں چمن میں بہار کی باتیں

ہم گنہگار نہیں ہیں یہ بتائیں کس کو
بہت جی چاہتا ہے ان دنوں آنسو بہانے کو
خاک اڑے جب میخانے میں کیا چھلکے پیمانے سے
صبا گزرتے ہوئے کہہ گئی سنا کیجیے

اب ان کا بات بات پہ منہ دیکھتے ہیں ہم — اب اپنے دل میں طاقت گفتار بھی نہیں
نہیں موقع یہ پرسش غم کا — دیکھیے دل دکھا ہوا ہے ابھی

اختر سعید خاں کے اوّلین مجموعہ کلام "نگاہ" میں (جسے ان کی نگاہ دقیقہ سنج نے کہیں ۶۲ برس کی عمر میں شائع کرانا گوارا کیا) اس طرح کے اشعار قدم قدم پر موجود ہیں اور ہمارے غزلیہ شاعری کا یہ وہ پایدار رنگ ہے جو زمانے کی گرد سے کبھی ماند اور مدھم نہیں پڑتا۔ ان کے ایسے اشعار میں فرسودگی اور قدامت کی جگہ دائمی اقدار کی تازگی اور جذبے کی خوشبو کا احساس ہوتا ہے اگر اختر سعید خاں نے محض ایسے ہی اشعار کہے ہوتے تب بھی تاریخ ادب میں ان کے لیے جگہ کی کمی نہ تھی لیکن بھوپال میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں اور سجاد ظہیر، سردار جعفری، ظ انصاری نیز دیگر مشاہیر ترقی پسند فنکاروں سے قریبی تعلقات نے انھیں اشتراکیت کے مثبت پہلوؤں کی طرف مائل کیا۔ "نگاہ" کا شاعر اس وقت کم و بیش پچیس برس کا نوجوان تھا لیکن ایک دیسی ریاست کے جاگیردار خاندان سے تعلق رکھنے والے اس نوجوان نے نئے نظریات کو قبول کرنے کی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھی بردباری اور متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اس دور میں جب اس کے کچھ ہم عصر مقامی شاعر "ہیارے میاں بھوکا ہے باپ اور ننگی ہے میاں" کے نعرے لگا کر نئے مسلمانوں کی مانند پیاز زیادہ کھا رہے تھے، اختر سعید خاں نے غزل کے مزاج اور کلاسیکی رکھ رکھاؤ کو مجروح کیے بغیر ترقی پسندانہ اشعار کہے جس کا نتیجہ مواد اور ہیئت کے نہایت خوشگوار امتزاج کی شکل میں نمودار ہوا۔ ثبوت کے طور پر یہ چند اشعار دیکھیے۔

جب بھی بڑھتا ہے اندھیرا سوئے دل — یہ چراغ اور بھی لَو دیتا ہے
بلندی سے ہماری سمت ہنس کر دیکھنے والو — بلندی خود ہمارے سامنے خم ہے جہاں ہم ہیں
گل بداماں موسموں کو کچھ ہمیں سے لاگ ہے — جب ہوا آئی چمن میں زخم دل کا چھل گیا
گدائے بے سروپا ہوں مگر یہ قصر وجود — لرز رہا ہے مری سطوت گدائی سے
یہ دن بھی صبح حشر سے نہیں ہے کم کسی طرح — مگر جو ہم نے کاٹ دی وہ رات ہی کچھ اور تھی
دیکھوں تو قفس کی تیلیوں سے — آئے کہ گئے بہار کے دن
نہ اٹھی میری نواؤں سے قیامت نہ سہی — ایک آہٹ تو ہوئی ایک دریچہ تو کھلا

بات یہ ہے کہ غزل میں اپنی نواؤں سے قیامت اٹھانے کی شعوری کاوش شعر کو نعرہ بنا دیتی ہے اختر سعید خاں نے ترقی پسندی کے کمال و زوال اور عمود و جمود کے کسی بھی دور میں آواز کو اتنا بلند نہیں کیا کہ وہ بکھر جائے یا غزل کا رنگ اتر جائے بایں ہمہ وہ ۱۹۴۵ء سے آج تک سچے ترقی پسند غزل گو رہے ہیں اور یہ سعادت غالباً ان کے مقامی معاصرین میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ سجاد ظہیر مرحوم، اختر سعید خاں کو ہندستان کے مٹھی بھر ترقی پسند غزل کہنے والوں میں شمار کرتے تھے اور ان کی اس بات پر ہمارے اکثر عمائدین خفا ہوتے تھے لیکن یہ بات آج بھی سچ ہے۔

پروفیسر ایم اے شاد

ایک شخصیت۔ایک مثلّث

بدل جاتے ہیں چہرے نام تو بدلا نہیں کرتے
تم اختر کو نہیں پہچانتے اچھا تو جانے دو

بھرا بھرا جسم، نکلتا ہوا قد، چہرے پر جوانی کے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی مدھم کرنیں، عقابی لیکن کھوئی کھوئی آنکھوں میں ماہ وسال کی طویل مسافت کی گرد، سر پر گزرے موسموں کی برف رفتار والہانہ اور گفتار شعلہ و شبنم کا لطیف امتزاج۔ نرم لیکن ترشا ہوا چہرہ تلفظ کی صحت کا وہ عالم گویا لفظوں کے پَر کتر رہے ہوں۔ الفاظ کی تہذیب کے پاسدار۔ زبان و بیان کی خوبصورت روایات کے امین، تہذیب و شائستگی، مروت و محبت، شرافت و رواداری اور قدیم و جدید کا پیکر دل نشین۔ تاریخ ادبیات بھوپال کا درخشندہ باب یعنی اختر سعید خاں! جب جب بھوپال کی ادبی روایات کا ذکر چھڑے گا یا جب کبھی بھوپال کے شعر و ادب کی تاریخ جدید مرتب کی جائیگی تو جو نام بہت زیادہ روشن اور بلند دکھائی دے گا وہ جناب اختر سعید خاں کا نام ہوگا۔ بہت ممکن ہے کچھ لوگ میرے خیال سے اتفاق نہ کریں اور میرے اظہار کو شاعرانہ تعلّی سے زیادہ اہمیت نہ دیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ پچھلے ۳۰۔۳۵ سالوں میں جو آواز سب سے زیادہ بلند بانگ اور جو لہجہ سب سے شرربار رہا ہے وہ جناب اختر سعید خاں کی ہی آواز اور لہجہ ہے۔ نظم ہو یا نثر، تحریر ہو یا تقریر اختر سعید خاں نے ہر میدان میں اپنا لوہا منوالیا اور اپنی شناخت پیدا کر لی۔ یہاں میرا مقصد اساتذہ کے احترام اور وقار کو مجروح کرنا نہیں ہے اور نہ ہی شعوری طور پر کسی شاعر یا ادیب کے قد کو چھوٹا کر کے دکھانا ہے اساتذہ کی حیثیت مسلّم ہے اور دیگر فن کاروں کا مقام اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے لیکن چونکہ یہ تاثرات انفرادی ہیں اس لیے اختلاف کی گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے۔

بھوپال — علماء فقہا اور شعرا کی سرزمین ہے۔ ہر زمانے میں یہاں ایسے باکمال دانش ور اور مفکر پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی علمی کاوشوں سے دیار ہند کے در و بام کی تزئین کا فریضہ انجام دیا۔ اپنی نگارشات کے ذریعہ بھوپال کا نام بلند کیا اور اہل بھوپال کے سروں پر فخر و مباہات کے تاج رکھے۔ نواب صدیق حسن خاں، ابو سعید بزمی، شعریٰ مجددی، ملّا رموزی، ذکی وارثی، حامد سعید خاں، سراج میر خاں سحر، باسط بھوپالی، وکیل

بھوپالی، شعری بھوپالی، کیف بھوپالی، تاج بھوپالی اور عشرت قادری وغیرہ نے شعروادب کے وہ چراغ روشن کیے جن کے اجالوں میں ایک نسل اپنی سمتِ سفر کا تعین کرسکی اور اپنی منزل کو پہچان سکی۔ اختر سعید خاں صاحب نے پوری ایک نسل کی ذہنی تربیت کی اور اپنی مخصوص طرزِ فکر اسلوب، لہجہ اور زبان و بیان کی ندرت اور تنوع کے وسیلے سے وہ مقام حاصل کر لیا جو اوروں کے لیے قابلِ رشک ہے۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے، روایت سے روایت جنم لیتی ہے اور ہر نئی نسل اپنی پیش رو نسل کے تجربات و اجتہادات سے استفادہ کر کے نئی منزلوں اور نئی جہتوں کی تلاش میں آگے بڑھ جاتی ہے اختر سعید صاحب کا تعلق بیک وقت دو نسلوں سے ہے۔ ایک طرف وہ روایت کے پاسدار اور امین ہیں تو دوسری سمت جدید عصری تقاضوں اور میلانات کے نقیب بھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ اختر صاحب کو دیکھ کر میرے ذہن سے GENERATION GAP کا تصور ہی مٹ جاتا ہے۔ قدیم سے گہرا روحانی رشتہ اور جدید سے فکری لگاو۔ بوڑھی نسل کے شاندار کارناموں کا اعتراف اور نوجوان نسل کے عزم و حوصلہ اور نئی منزلیں سر کرنے کے جذبے کا احترام۔ اس طرح ان کا تعلق دو نسلوں سے جڑ جاتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ قدیم و جدید کے درمیان کی ایک کڑی ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔

شاید ۱۹۵۰ء کی بات ہے اس وقت میں اسکول میں پڑھتا تھا، گرمیوں کا زمانہ تھا امتحانات ختم ہو چکے تھے ایک رات صدر منزل میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ میں بھی اپنے ایک عزیز کے ساتھ مشاعرہ سننے جا پہنچا۔ ادب سے بس یوں ہی تھوڑی سی واقفیت تھی شعر بھی ٹھیک ڈھنگ سے نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن بعض اشعار اتنے اثر انگیز ہوتے جو نہ جانے کیوں ذہن و دل کو متاثر کر جاتے۔ اس مشاعرے میں میں نے اختر بھائی کو شاید پہلی بار دیکھا تھا۔ سفید چوڑی دار پاجامہ اور سفید شیروانی میں ملبوس ایک نوجوان جس کے شباب کا آفتاب نصف النہار پر تھا انتہائی والہانہ انداز میں پڑھ رہا تھا۔

کسی نے چپکے سے دل کا مزاج پوچھ لیا
بہت دنوں میں طبیعت جو راہ پر آئی

ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہو رہے تھے۔ ان دنوں میں دل کے مزاج سے تو پوری طرح واقف نہ تھا لیکن ایک عجیب کیفیت بے لفظ و معنی مجھ پر طاری تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ شعر اچھا لگا اور ذہن سے چپک کر رہ گیا۔ اور اتنی مدت گزرنے کے بعد آج بھی جب اس شعر کی معنویت اور طلسماتی کیفیت مجھ پر کھلتی ہے تو دل و دماغ وجد کرنے لگتے ہیں۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ اچھا شعر وہ ہے جسے محسوس تو کیا جاسکے لیکن جس کے معنی بیان کرنا بہت مشکل ہوں اور جو تشریح و تفسیر کا متحمل نہ ہو۔ مجھے یہ شعر اس دلیل کی مکمل مثال نظر آتا ہے۔

وقت کا پرندہ اپنے سیاہ و سفید پروں سے اڑتا رہا، اور پھر وہ زمانہ آیا جب میں کالج پہنچ گیا۔ مشاعروں میں شرکت بڑھنے لگی اور اختر بھائی کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ کالج کے مشاعرے حلقۂ ارباب ادب کی نشستیں اور شہر کی مختلف انجمنوں کی جانب سے منعقد کی جانے والی ادبی تقریبات غرضیکہ ہر جگہ اختر کو پیش پیش دیکھا۔ ویسے تو اسکول کے زمانے سے ہی میں کچھ نہ کچھ کہنے لگا تھا لیکن اب مبتدیوں کی صف میں بیٹھ کر اپنے بزرگوں سے کچھ سیکھنے کی خواہش کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی اور پھر وہ دن بھی آیا جب میں اس دروازے تک پہنچ گیا جسے باب ادب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اور شجاع خاں کے پاس ایک سوالہ پوش لیکن اپنے مکینوں کی طرح کشادہ مکان جس کے دروازے اہل ادب کے لیے ہمیشہ کھلے رہے۔ جہاں دنیائے ادب کی مقتدر ہستیاں قیام پذیر رہیں اور اختر سعید خاں، اظہر سعید خاں کی مسکراہٹیں اور حامد سعید خاں کی شفقتوں کے اجالے بکھرتے رہے۔ یہ نیم پختہ مکان دو نسلوں کے نمایندہ شعراء کو اپنے دامن میں لیے ہوئے تھا یعنی حامد سعید خاں مرحوم۔ اختر سعید خاں اور اظہر سعید خاں۔ یہ نیم پختہ مکان میرے لیے دانش کدہ تھا، گہوارۂ علم وادب اور مرکزِ شعر و سخن تھا اور آج بھی جبکہ یہ مکان ایک پختہ جدید طرز کی عمارت کی شکل اختیار کر چکا ہے، حامد سعید خاں صاحب مرحوم ہو چکے ہیں اور اظہر بھائی ترک وطن کر چکے ہیں اس کے وقار اور تاریخ ساز کردار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج یہ مکان اپنے آپ میں ایک روایت بن چکا ہے، بھوپال کی ادبی تاریخ کا ایک مکمل عہد، ایک زمانہ۔ آہستہ آہستہ اختر سعید خاں اختر صاحب اور پھر اختر بھائی ہو گئے اور اس رشتے سے حامد سعید خاں صاحب میرے بھی میاں حضور بن گئے، پھر آمد و رفت بڑھنے لگی۔ اظہر بھائی کی محبتیں، میاں حضور کی شفقتیں اور اختر بھائی کا بے پناہ خلوص مجھ پر مثل ابر نیساں برسنے لگا۔ اختر بھائی ہر مشاعرے میں میرا حوصلہ بڑھاتے، اچھے شعر پر کھل کر داد دیتے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے، ان کا یہ کرم اور شفقت آج بھی قائم ہے۔

اختر بھائی نے کام مکمل کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ پتا نہیں شاعروں کو وکالت سے اتنی رغبت کیوں ہے۔ یہ پیشہ ان کی شاعرانہ افتادِ طبع کے بالکل منافی ہے لیکن شاید پیشرو شعراء کی اتباع یا ملازمتوں کے بندھن سے خود کو آزاد رکھنے کے جذبے نے انھیں قانون کے گورکھ دھندے میں الجھا دیا۔

اختر بھائی نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی وہ FEUDAL معاشرہ تھا جاگیر داری نظام اپنی تمام تر قہرمانیوں کے ساتھ معاشرے پر حاوی تھا۔ ادب و صحافت، شعر و سخن غرضیکہ تمام فنون لطیفہ اس نظام کے پروردہ اور اس کے زیر اثر تھے۔ ایک طرف انگریزی سامراج کا استعمار و استحصال، دوسری طرف غربت، افلاس، جبر و استبداد اور لوٹ کھسوٹ، ہندستانی سماج کا جزو لاینفک تھے۔ فیوڈل سوسائٹی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے تمام وسائل استعمال کر رہی تھی۔ انگریزی تعلیم اور مارکس کی جدلیاتی مادیت کا طلسم

جدید ذہن کو بغاوت اور آخری لڑائی کے لیے آمادہ کر رہا تھا۔ نئی قدریں سر اٹھا رہی تھیں اور پرانی اور کھوکھلی قدروں کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں، نئے مسائل نئے موضوعات اور نئے میلانات نثر و نظم دونوں میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ ادب کا تصور بدل رہا تھا اور اسی کا رشتہ براہ راست زندگی اور عوام سے جڑ رہا تھا۔ شکست و ریخت کے اس ماحول میں اختر بھائی کی تربیت ہوئی لیکن ان کی فطرت FEAUDAL SOCIETY کی فرسودگی کو آنکھیں بند کر کے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنے سماج کی زندہ اور طاقتور قدروں کو قبول کیا اور مردہ اقدار سے روگردانی کی۔

اختر بھائی نے شعر و ادب کا ورثہ اپنے بزرگوں سے پایا۔ میاں حضور (حامد سعید خاں مرحوم) خود ایک بلند مرتبہ اور قادر الکلام شاعر تھے وہ اپنے دور کی انتہائی معتبر آواز تھے۔ انھوں نے غزل میں عصری مسائل کو روایت کی پاسداری کے ساتھ شامل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وہ قدرت، توانائی اور تپش ہے جو ان کے ہم عصر شعراء میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ شفیق باپ نے ذہین بیٹے کی شعری تربیت کچھ اس طرح کی کہ اختر خانہ کو اختر آسمانِ ادب بنا دیا چنانچہ اختر بھائی خود فرماتے ہیں "میں نے جو کچھ پایا اپنے باپ حامد سعید خاں صاحب مرحوم کی توجہ اور اپنے بھائی اظہر سعید کی رفاقت سے"، عمر کے ۷۰ سال گزرنے کے باوصف

"مزاج من از حالِ طفلی نہ گشت"

اظہر بھائی کی رفاقت نے اختر بھائی کے شعری سفر میں ایک مخلص دوست کا کردار ادا کیا۔ اظہر بھائی بھوپال کے صفِ اوّل کے شاعر اور بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کے پاکستان چلے جانے سے اگر ایک طرف بھوپال کی ادبی فضا میں ایک خلا پیدا ہو گیا تو دوسری سمت اختر بھائی کی تخلیقی صلاحیتوں کو بہت گہرا صدمہ پہنچا۔ کرب، اذیت اور اضمحلال نے اختر بھائی کو ایک طویل عرصے تک معطل رکھا۔ پھر آہستہ آہستہ برف پگھلی وقت کے مرہم نے زخموں کو مندمل کیا اور پھر سے فکر کے سوتے پھوٹے اور نغموں کی شمعیں روشن ہوئیں۔

اختر بھائی نے اپنے شعری سفر کا آغاز غزل سے کیا کیونکہ یہی صنف آج کی طرح اس زمانے کی بھی سب سے مقبول صنف سخن تھی اور یوں بھی عموماً شعراء اپنی شعری زندگی کا آغاز غزل سے ہی کیا کرتے ہیں۔ ابتدائی غزلوں میں عشق کی آگ، جذبے کی تپش اور واردات قلب کا بڑا دل نشین اظہار ہے۔ یہ زمانہ ہندستانی سیاست کا سب سے صبر آزما دور تھا۔ جد و جہد آزادی اپنے شباب پر تھی۔ سرفروشانِ آزادی جان ہتھیلیوں پر لیے اپنے گھروں سے نکل پڑے تھے۔ انقلاب زندہ باد اور انگریزو ہندستان چھوڑ دو کے نعرے فضا میں گونج رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک نے ادباء اور شعراء میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ آزادی کے نغمے گائے جا رہے تھے۔ گل و بلبل، بادہ و ساغر، چشم و عارض اور عشق و محبت

کے مضامین کی جگہ نئے عصری موضوعات نے لے لی تھی۔ طوق وسلاسل، زندان وصلیب، دستِ ستم اور کوچہ قاتل موضوع سخن بن گئے تھے۔ سامراجی لوٹ کھسوٹ اور جبر واستبداد کے خلاف نعرۂ انقلاب بلند ہو رہا تھا۔ شعراء کو غزل کی تنگ دامانی سے شکایت ہونے لگی چنانچہ انھوں نے نظم کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ غزل گردن زنی قرار دی گئی اسے بوڑھی نائکہ کہا گیا۔ جوشؔ، فیضؔ سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، مجاز اور جذبی نے ہم کے طور پر وہ ادب تخلیق کیا جس کے مخاطب براہ راست عوام تھے اور جس کا پیغام آزادی اور ایک نئے سماج کی تشکیل تھا اس زمانے میں جن شعراء نے غزل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ان تمام سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو نئی علامتوں اور خوبصورت تراکیب کے سہارے غزل کی تمام تر روایت اور نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیش کیا ہے ان میں فراقؔ اور مجروحؔ سرفہرست ہیں جو کام دوسرے نظم کے ذریعہ انجام دے رہے تھے۔ یہ شعراء وہی فریضہ غزل کے وسیلے سے انجام دے رہے تھے۔ اختر بھائی بھی اس تحریک کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے اور اپنی غزلوں میں عصری تقاضوں کی عکاسی کرنے لگے۔ اس کے بعد موضوعات کے تنوع کے پیش نظر انھوں نے نظم کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا آج اگرچہ وہ ادب جسے "عبوری ادب" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور جسے میں اپنی اصطلاح میں "کفِ سیلاب" کہنا پسند کروں گا اپنی افادیت کھو چکا ہے لیکن تحریک آزادی میں اس کے عظیم تاریخ ساز کردار سے چشم پوشی ممکن نہیں۔

۴۷ء میں ہندستان آزاد ہوا لیکن آزاد ہندستان کے جو خواب ہمارے شعراء نے اپنی آنکھوں میں سجائے تھے ان کی تعبیر الٹی نکلی۔ ان کے نزدیک آزادی کا اجالا داغدار تھا اور صبح آزادی شب گزیدہ تھی چنانچہ اختر بھائی کو بھی کہنا پڑا

سحر ہوئی تو ما حصل یہ تھا شب امید کا
جو اعتبار تھا گیا، جو انتظار تھا رہا

آزادی کے بعد اختر بھائی نے متعدد موضوعاتی نظمیں کہیں جن میں "غبار خاطر" ۴۷ء، "نئے انسانوں کا کورس" ۴۹ء، "جمہوریہ ہند کی تیسری سالگرہ" ۱۹۵۳ء، "لمحہ فکریہ" ۱۹۷۲ء اور "خون کی قیمت" ۱۹۷۲ء قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں جہاں شکست خواب کی سی کیفیت ہے وہیں ایک نئے نظام کی آواز پا بھی سنائی دیتی ہے۔ امن عالم کی ضرورت اب ایک تحریک بن چکی تھی چنانچہ "نئے انسانوں کا کورس" دراصل امن کے متوالوں کا کورس ہے جو جنگ اور جنگ بازوں سے نفرت کرتے ہیں۔ انسان اور انسانیت کی بقا کے لیے امن کو ناگزیر سمجھتے ہیں لیکن اختر بھائی کی شاعری کے بعد جو چیز پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظمیں اتنی جاندار اور طاقتور نہیں کہ ان سے اختر بھائی کے مقام کا تعین کیا جا سکے۔ ان کی غزل میں عصری حسیت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے ان کا مزاج رومانی ہے لیکن معاشرت اور زندگی کے بنیادی مسائل دل نشین تمثیلوں، علامتوں اور خوبصورت پیکروں کی شکل میں اس طرح غزل کے قالب میں ڈھل

جلتے ہیں کہ نہ تو غزل کا صوتی حسن مجروح ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی معنویت میں کوئی فرق آتا ہے۔ فکر کی آنچ اور نظریے کی تپش سے ان کا فن نکھر گیا ہے۔

اختر بھائی، ہم سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں اسی اعتبار سے ان کا کلام مارکس ازم کے زیر اثر ہے وہ اس طبقاتی اور استحصالی نظام سے نا مطمئن ہی نہیں بلکہ اسے ڈھا کر ایک نئے سماج کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک ایسے سماج کی تصویر ہے جہاں محنت سربلند ہے، جہاں محبت، شرافت، مساوات، رواداری اور انسان دوستی ہے۔ جہاں لوٹ استحصال نہیں۔ انھیں یقین ہے کہ یہ سماج جو ظلمات کی علامت بن گیا ہے اس کی صبح ضرور آکر رہے گی اور آفتاب تازہ کی ایک کرن ظلمات کے وجود کے لیے تازیانہ مرگ ثابت ہوگی چنانچہ فرماتے ہیں۔

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی

اس نئی صبح اور بہار نو کے لیے تمام انسانوں کی مشترک متحد مساعی کی ضرورت ہے چونکہ یہ نظام تو کہیں باہر سے نہیں آنے والا بلکہ اسی خاک سے جنم لینے والا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہم صفیران چمن مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہوگی

اور پھر کہتے ہیں۔

بوئے گل آتی ہے مٹی سے چمن کی جب تک
ہم پہ دہشت نہ خزاں کی کبھی طاری ہوگی

کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کو سیاسی نظریات کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس طرح وابستہ ہو کر شاعری کا وقار کم ہو جاتا ہے اور اصلاً وہ شاعری نہیں رہتی بلکہ تبلیغ بن جاتی ہے شاعر کو آزاد ہونا چاہیے۔ اس کی فکر کے پیروں میں نظریوں کی زنجیر نہیں ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ اس سے کسی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن اسے کلیے کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ آج یہ بات بہت زور و شور سے کہی جا رہی ہے ادب فلسفے کی پیداوار نہیں ہوتا۔ اگر اتفاقی طور پر ادب سے کسی فلسفے کی نشاندہی ہوتی ہے تو یہ محض اتفاقی امر ہے۔ جدید شاعر اس شاعری کو بڑا کہتا ہے جو ہر نظریے اور فلسفے سے بالاتر ہو، لیکن اختر خاں صاحب اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے کیونکہ بغیر کسی نظریے کے نہ تو فکر کے بال و پر کھلتے ہیں اور نہ ہی فن اور فن کار کی سمت کا تعین ہوتا ہے چنانچہ ہر وہ فلسفہ یا نظریہ جو انسانیت کا وقار بڑھاتا ہو، زندگی سے پیار اور انسان دوستی کی شمعیں جلاتا ہو انھیں عزیز ہے۔ وہ زندگی سے پیار کرتے ہیں، زندگی جہاں اور جس حال میں ہے انھیں عزیز ہے وہ اس سے عہد وفا استوار کیے ہوئے ہیں اور اس کے لیے، اس سربلندی کے لیے مٹ جانا چاہتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خاک ہو کر تری راہوں میں بکھر جاؤں گا میں زندگی تجھ سے وہی عہد وفا ہے آج بھی

اختر بھائی کی شاعری خلا کی شاعری نہیں، اسی زمین کی شاعری ہے جہاں انسان بستے ہیں اگرچہ ان کی فکر ہفت افلاک کی سیر کرتی ہے لیکن ان کے قدم اس دھرتی پر جمے رہتے ہیں جہاں خواب سلگتے ہیں اور آرزوئیں دھواں بن کر بکھر جاتی ہیں۔ لیکن وہ اس عالم گزراں سے نہ خوف زدہ ہیں نہ مایوس بلکہ اس مشینی دور کی بے یقینی اور بے جہتی پر ان کا غم ہیج پڑتا ہے۔

یقیں ہے نہ گماں ہے ذرا سنبھل کے چلو
عجیب رنگِ جہاں ہے ذرا سنبھل کے چلو
سلگتے خوابوں کی بستی ہے رہگزار حیات
یہاں دھواں ہی دھواں ہے ذرا سنبھل کے چلو

اختر صاحب نے اپنی شاعری سے ایک مشن کا کام لیا ہے اور وہ اس سے مطمئن بھی ہیں انھیں اس کی بالکل پروا نہیں کہ اہل دانش انھیں کس انداز سے یاد کرتے ہیں اور یاد کرتے بھی ہیں یا نہیں۔ انھوں نے تو رہگزر حیات پر اپنے نقوشِ پا کے چراغ روشن کر دیے۔ فرماتے ہیں ؎

ہم تو ویرانے میں کچھ نقش جنوں چھوڑ چلے
اب ہمیں اہل جنوں یاد کریں یا نہ کریں

پچھلے چند سالوں میں اردو شاعری میں ایک زبردست تبدیلی آئی ہے ایک نیا موڑ آیا ہے نئے استعارے، نئے علائم اور نئی تشبیہات نے اظہار و بیان کے لیے نئی راہیں تلاش کی ہیں۔ سارتر کی وجودی فکر نے عہد حاضر کو نئے اسلوب اور نئے لہجے سے آشنا کیا اور اظہار ذات و تلاش ذات پر توجہ مرکوز کی، مارکس کی جدلیاتی مادیت نے فرد کے بجائے جماعت پر زور دیا تھا اس طرح فن کا سفر درون سے خارج کی طرف تھا۔ فرد سے جماعت کی جانب تھا انفرادی مسائل کے بجائے اجتماعی مسائل کی طرف تھا اس تحریک کے زیر اثر جو ادب تخلیق ہوا اس میں انکشافِ ذات نہ ہونے کے برابر تھا لیکن وجودیت کے زیر اثر اب پھر خارج سے دروں کی طرف مراجعت شروع ہو چکی ہے اور فن کار اپنی ذات کی تلاش اور اس کے انکشاف کے لیے سرگرداں ہے۔ کرب ذات، کرب آگہی، تنہائی کا قلزم سیاہ اور وجود کی معنویت کے ادراک کا عمل مسلسل دراصل جدید شاعری کے چند خاص موضوعات ہیں چنانچہ اختر بھائی کی شاعری پر بھی اس تحریک کے اثرات دکھائی پڑتے ہیں اور ایک حساس فن کار کے لیے یہ عمل فطری بھی ہے۔ اگرچہ اختر بھائی نے اس تحریک کو نظریے کے طور پر قبول نہیں کیا ہے چونکہ وہ ایک تاریک کمرے میں سیاہ بلی کو پکڑنے کی کوششِ لاحاصل کے قائل نہیں ہیں تاہم ان کی شاعری میں اس تحریک کا ہلکا سا عکس ضرور دکھائی پڑتا ہے خصوصاً پچھلے دو تین سالوں میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ کسی حد تک میری دلیل کی تائید کرتا ہے مثلاً ؎

یہ جو ہم صورت ہے میرا کس قدر معصوم ہے ‏ ‏ ‏ کتنی امیدوں سے مجھ کو دیکھتا ہے آج بھی

کچھ نظر آتا تو ہے وہم و یقیں کے درمیان
یہ مرا سایہ ہے یا میں ہوں بتاؤ تو سہی

ایک سایہ ہے کہ پیچھا کر رہا ہے آج بھی
کون ہے یہ جو مجھے پہچانتا ہے آج بھی

جناب آل احمد سرور صاحب نے ٹھیک ہی فرمایا تھا کہ ادب و شاعری بندھے ٹکے اصولوں کی تبلیغ کا نام نہیں ہے بلکہ محسوس حقائق کی معنی خیز مصوّری ہے چنانچہ اختر بھائی کے کلام میں اب جو تبدیلی آئی ہے اس میں نہ خطابت ہے نہ تبلیغ، نہ کسی نظریے کی اشاعت ہے اور نہ ہی کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈہ بلکہ داخلی کیفیات کا بھرپور اظہار۔ ملاحظہ ہو۔

خراب آرزو کہتے ہیں کس کو پوچھتے کیا ہو
میں کب سے موت کی وادی میں زندہ ہوں مجھے دیکھو

یا

الگ رہنے دو اس کو عشق کی پامال رسموں سے
یہ اک نازک سا رشتہ جس کو میں سمجھوں نہ تم جانو

اور پھر فرماتے ہیں ؎

کتاب زندگی اس گھر کی دیواروں پہ لکھ آئے
اب اس کے بعد باقی کیا ہے موضوعِ سخن اختر

اختر صاحب نظم اور نثر دونوں پر برابر دسترس رکھتے ہیں ان کے تنقیدی اور موضوعاتی مضامین ملک کے مختلف رسائل اور آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ ہم تک پہنچتے ہیں۔ ان کی نثر کا اسلوب بھی جدا ہے۔ پیرایۂ اظہار انتہائی دل نشین اور حرف و صوت و معنی کا بہت خوبصورت امتزاج ہے۔ ان کی نثر کہیں انشائے لطیف اور کہیں نظم منثور دکھائی دیتی ہے وہ جتنے اچھے نثار ہیں اتنے ہی اچھے خطیب ہیں۔ گل افشانی، گفتار کے ساتھ شعلہ بیانی بھی ان کی تقریروں کا خاصّہ ہے اور وہ گھن گرج کہ کبھی ایسا محسوس ہو جیسے کہیں اونچائی سے کوئی آبشار گر رہا ہو اور کبھی یوں لگے جیسے نسیم سحر کے دل نواز جھونکے پیام سکون دے رہے ہوں۔ کبھی شبنم برس رہی ہے۔ کبھی شعلے بھڑک رہے ہیں۔ ایک شخص کا مکمل تکون۔ شاعر۔ ادیب اور خطیب ۔ تینں پہلو اور ہر پہلو اپنی جگہ مکمل! یہ سعادت ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔ اختر بھائی ہماری آبرو اور بھوپال کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ وہ ایسی شمع رہگزر ہیں، جس کے اجالوں میں نئی نسل کا قافلہ آگے بڑھ رہا ہے خدا اس شمع کو تا ابد فروزاں رکھے اور اس کے اجالوں کو عمرِ دوام عطا فرمائے۔

عزیز قریشی

چیئرمین اردو یونیورسٹی کمیٹی

وزارت تعلیم حکومت ہند

نئی دہلی

یادوں کے گریبانوں کے رفو...''

"...... اور پھر اس سنّاٹے میں عجیب و غریب آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں... ایسا لگا جیسے تاریک ویران گلی میں بھاری بھاری رتھ گزر رہے ہیں اور ان رتھوں پر زرتار چھتروں کے نیچے...... اجنبی انسان اسے جھانک رہے ہیں...... پلید روحوں کی یلغار شروع ہوگئی۔ وہ رتھوں سے اتر کر سارے میں پھیل گئے...... بھوتوں کا ایک پورا جلوس ان کا تعاقب کر رہا تھا...... یہ بہت سے جانے پہچانے بھوت تھے جو دانت نکوستے۔ لنگڑاتے۔ اچھلتے کودتے چلے آ رہے تھے۔ کلچر کی رسّی ٹوٹ گئی ہے پھر بھی یہ بھوت ہمارا تعاقب کر رہے ہیں...... یہ ہم تمام لوگوں کے مشترکہ بھوت ہیں، اور یہ بھوت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے کیوں کہ ہم خود اس قافلہ میں شامل ہونے والے ہیں...... بھوت۔ لاشیں۔ ارواحِ خبیثہ...... تمھیں ان سے ڈر نہیں لگنا چاہیے کیوں کہ ہم سب برابر خود ان لاشوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں...... ان لوگوں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان لوگوں کو بلانا شروع کیا۔ ان کی آوازیں ان کی سمجھ میں نہ آئیں۔ چڑیوں کی چہکار کی طرح سریلی۔ مبہم۔ سارنگی کی چیخ کی مانند تیز، سریلی...... یہاں سے بھاگ چلو۔ آگے چلیں......

ان آوازوں سے بچ کر کہاں جاؤ گے...... یہ آخری آوازیں ہیں۔''

(آگ کا دریا۔ قرۃ العین حیدر)

ماضی کی یادوں کے بھوت میرا تعاقب کر رہے ہیں...... غالباً ۱۹۴۷ یا ۱۹۴۸ کی بات ہے نوابوں اور بیگمات کی زیر حکومت رہنے والی دو سو چالیس سال پرانی ریاست بھوپال اپنے وجود اور بقا کی آخری لڑائی لڑ رہی ہے...... بھوپال شہر کے میونسپل انتخاب کے نتائج نکل چکے ہیں...... ہرا صندوق۔ لال صندوق۔ پیلا صندوق... امیدواروں کے انتخابی نشان اس زمانے میں اسی طرح ہوا کرتے تھے...... سفید شیروانی۔ تنگ پائجامہ پہنے...... ہاروں سے لدے ہوئے ایک خوبصورت جاذب نظر چھریرے بدن کا ایک دلکش نوجوان جس کے پیچھے ایک لمبا چوڑا جلوس تھا...... محلے کے گھر گھر جا کر بزرگوں کی دعائیں بٹور رہا ہے اور مبارکبادیاں قبول کر رہا ہے...'' ارے بھئی

اختر سعید ہے "۔۔۔۔۔" اماں وہی اپنے حامد دادا کا لڑکا"۔۔۔"ارے خاں ابھی تو علی گڑھ سے آکر وکالت شروع کی تھی"۔۔۔۔۔۔ ہاں یار ایکدم سے میونسپلٹی کی ممبری ماردی۔۔۔۔۔۔" ارے خاں کمال ہے۔۔۔۔۔۔"

اور نہ جانے ایسی کتنی ہی آوازیں تھیں جن کی گونج آج بھی میرے کانوں میں ہے۔۔۔۔۔۔ یہ شاید میرا باقاعدہ تعارف تھا جو اختر سعید صاحب سے ہوا تھا اور آج تک یادوں میں محفوظ ہے۔

اختر سعید صاحب کے اور میرے خاندان کے دیرینہ مراسم شاید تین پشتوں کے ہیں۔۔۔۔ اس کے علاوہ وہ اور میرے ماموں جناب اختر علی خاں علی گڑھ یونی ورسٹی میں ایک ہی زمانے میں طالب علم تھے اور ایک ہی کمرے میں یونی ورسٹی ہوسٹل میں رہا کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی اور مشہور شاعر جناب اظہر سعید بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایک اور قریبی رشتہ یہ ہے کہ وہ میرے دوسرے ماموں جناب منور علی خاں کے برادر نسبتی ہیں اور اب سمدھی بھی ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔

میرا بچپن بھی اسی محلے میں گزرا ہے جہاں اختر سعید صاحب کا آبائی گھر ہے۔ جلیبی اڈہ شجاع خاں (بگاڑ کر اڈہ سوجے خاں) یا مسجد شکور خاں بھی کہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اختر سعید صاحب کے والد بزرگوار اور بھوپال کی سربرآوردہ شخصیت اور ایک مایہ ناز۔ ممتاز اور منفرد شاعر جناب حامد سعید خاں مرحوم کا گھر بھوپال کی ادبی سرگرمیوں کا گہوارہ و مرکز بنا ہوا تھا۔ اور ہندستان کے بیشتر ممتاز ادیب، شاعر اور دانشور، جو بھی بھوپال آتے تھے۔ ان ہی کے مہمان ہوتے تھے۔۔۔۔۔۔

اسی لیے اختر سعید صاحب سے میرا ایک جذباتی لگاؤ رہا ہے۔ ایک زمانے میں وہ میرے آئیڈیل بھی رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میری طرح کے بہت سے جذباتی اور بے وقوف نوجوان اس یقین کے ساتھ احمقوں کی اس جنت تصور میں گرفتار تھے کہ خدا کی بنائی ہوئی اس سرزمین کو اس پر کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگنے والے عام انسانوں کی خواہشات اور ضرورتوں کے مطابق زندہ رہنے کے لیے ایک خوبصورت صحت مند اور بہتر دنیا بنایا جاسکتا ہے۔۔۔۔ جب لگتا تھا کہ صدیوں کا چھایا ہوا یہ اندھیرا دور ہوگا اور آنے والا کل ایک نئے سورج کو طلوع کردے گا۔۔۔۔ مگر اس آنے والے کل کے انتظار کی صلیب پر نہ جانے کتنے کیریر، کتنے مستقبل بھینٹ چڑھا دیے گئے۔۔۔۔۔ اس آنے والی صبح کے انتظار میں نہ جانے کتنی زندگیاں اندھیرے اور گمنامی کی وادیوں میں ڈھکیل دی گئیں۔۔۔۔۔۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آزادی کا پرچم لہرائے جانے کے بعد ہندستان کا نوجوان اس داغ داغ اجالے اور شب گزیدہ سحر سے مایوس۔ غصے، ناامیدی اور فرسٹریشن کا شکار تھا اور ایک نئے انقلاب کی تلاش میں تھا۔۔۔

لکھنؤ، اندور، گوالیار، پٹنہ اور دیگر مقامات پر پولیس کا طلبہ پر گولی چلانا اور طلبہ کی شہادت پر سارے ملک کے نوجوانوں میں غم و غصہ کی ایک لہر تھی۔۔۔۔۔ مگر پھر بھی دل کی وادیوں کے اپنے تقاضے تھے اور وہ پوری طرح جاگ رہی تھیں۔ بے روزگاری تھی مستقبل تاریک لگتا تھا۔۔۔۔۔۔ پھر بھی دل کے ہاتھوں مجبور سرپھروں کو اپنی دھڑکنوں کی آواز تو سننا ہی پڑتی تھی اور ان کی بنیاد پر اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے محل بنانا بھی ضروری تھے۔۔۔۔ حالانکہ انقلاب کی جستجو میں سرگرداں اور نئے نظام کے قیام کے لیے پریشان "سرپھرے عاشق"، یہ بخوبی جانتے تھے کہ دل کی وادیوں کے تمام راستے کوئے یار سے ہوتے ہوئے "سوئے دار" نکلتے تھے۔۔۔۔!

اختر سعید صاحب جنھیں پیار سے لوگ اختر بھائی بھی کہتے ہیں اس زمانے میں بھوپال کے عوام، طلبہ اور نوجوانوں کے محبوب ترین شاعر اور دانشور تسلیم کیے جاتے تھے (خاص طور پر خواتین میں ان کی مقبولیت بے پناہ تھی) وہ اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کے ایک اور فعال دانشور متھرا بابو کے ساتھ مل کر طلبہ اور نوجوانوں کو آلام روزگار کو آسان بنانے کے لیے "غمِ جاناں کو غمِ دوراں بنانے" کا درس دے رہے تھے۔۔۔۔

ایک دن حمیدیہ کالج کے شاندار ہال میں (جہاں آج کل مدھیہ پردیش کی ودھان سبھا ہے) جب انھوں نے اپنی ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر غالباً اس طرح تھا۔

ہمیں بھی ذوقِ جنوں ملا تھا ہمیں بھی تھا شوقِ چاک داماں
بات دل کی جو مان لیتے تو منہ زمانے کو کیا دکھاتے

تو ایسا لگا جیسے پہاڑوں پر جمی ہوئی بہت سی برف پگھل گئی ہو۔۔۔۔۔ دنوں، ہفتوں اور مہینوں تک یہ شعر دل و دماغ پر ہتھوڑے چلاتا رہا۔۔۔۔ انجام کار میں بھی نہ جانے کتنی آرزوؤں، تمناؤں اور خوابوں کو دل کی وادیوں سے نکال، کسی گمنام اور انجان کھائی کی گہرائیوں میں دھکیل کر آگے بڑھ گیا۔۔۔۔۔ اور پھر دوبارہ اس طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔۔۔۔۔ میری طرح نہ جانے اور بھی کتنے دوسرے پاگل بھی تھے۔۔۔۔۔ کیونکہ زمانے کو منہ تو بہرحال دکھانا تھا۔۔۔۔۔ جاگیرداری اور شخصی نظام کی روایتوں سے مالا مال اس شہر میں اختر بھائی نے ایک پوری نسل کے نظریات اور خیالات کو موڑ کر ترقی پسند راہوں تک لے جانے کی انتھک کوشش کی ہے وہ ایک کارنمایاں ہے۔ شاید میری اس بات سے کچھ لوگ اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اختر بھائی نے اپنے قلم و زبان کے استعمال سے جو عظیم کام کیا ہے اس کے نقوش مٹائے نہیں جا سکتے۔

اختر بھائی کی ذہانت، لیاقت اور شرافت کے ان کے دشمن بھی معترف ہیں۔ (ان کا جسمانی حسن اور وضع داری اس کے علاوہ ہیں) ان تینوں اجزا پر مشتمل تکون بھی ذرا مشکل ہی سے ملتا ہے۔ اختر بھائی جتنے اعلا درجے کے شاعر ہیں اسی اعلا پایے کے وکیل بھی ہیں اور غالباً اتنے ہی اچھے شطرنج کے کھلاڑی بھی ـــ بھوپال میں عرصے

تک یہ مذاق کیا جاتا رہا ہے کہ اگر اختر بھائی شاعر اور شطرنج کے کھلاڑی نہ ہوتے تو شاید ہندستان کے گنے چنے وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا...... قریبی دوست، رشتہ دار، ملنے والے، سماجی، ادبی و سیاسی حضرات اپنے مقدموں میں اختر بھائی سے مفت قانونی مشورہ لینا اور ان سے وکالت نامہ لگوانا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اور سارا کام کرا کر بھی کسی قسم کی فیس یا محنتانہ نہ دینا اپنا حقِ خود اختیاری۔...... اور اختر بھائی بھی فیس مانگنے میں اتنے ہی تکلف اور تامل سے کام لیتے ہیں جتنا روایتی گھرانے کی دینی شعار سے مالا مال کوئی شرمیلی خاتون اپنا حقِ مہر مانگنے میں کرتی ہے۔

اختر سعید صاحب کا چہرہ جتنا حسین ہے۔ یقیناً ان کا دل بھی اتنا ہی خوبصورت ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ جذباتی بھی ہیں اور دوسروں کے رنج و غم اور تکلیف سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں...... میں نے ایسے کئی تکلیف دہ مواقع پر انھیں دوسروں کے لیے آنسوؤں کی جھڑیاں لگاتے دیکھا ہے۔ اختر بھائی اب بھوپال کی ان چند گنی چنی ہستیوں میں سے ایک ہیں جنھیں پرانے بھوپال کی آبرو کہا جاتا ہے...... پہاڑیوں، تالابوں اور جھیلوں کے اس شہر میں جہاں آج بھی شبِ مالوہ کی زلف عنبر بار کی مشک آمیز مہک محسوس کی جاسکتی ہے...... جہاں لگ بھگ ڈھائی سو سال تک نوابوں اور بیگمات کی حکومت رہی ہے...... پرانا بھوپال...... اس ڈوبتے ہوئے شہر کی مٹتی ہوئی تاریخ آج بھی گواہ ہے کہ یہاں مذہب کے نام کبھی کوئی فساد نہیں ہوا۔ مسلم حکمراں اور جہاں پولیس اور فوج اور سرکاری ملازمتوں میں تقریباً اسّی فیصد سے بھی زیادہ مسلمان تھے کبھی کسی ہندو شہری کے ایک کیل تک نہیں چبھی اور ان کا جان و مال اور عزت و ناموس مکمل محفوظ رہا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات تک میں یہاں مکمل امن رہا۔ لیکن آج اختر بھائی مایوس ہیں اور کچھ ٹوٹ سے گئے ہیں...... کبھی لگتا ہے جیسے زندگی سے انھیں زیادہ دلچسپی نہیں رہ گئی ہے...... میں نے انھیں کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا...... مجھے یاد ہے اس زمانے میں جب ڈاکٹر شنکر دیال شرما مرکز میں وزیر تھے اور جناب پرکاش چند سیٹھی مدھیہ پردیش کے وزیر اعلا تھے اور میں بھی ان کی کیبنٹ کا ایک معمولی وزیر تھا...... جناب اختر سعید کا نام مدھیہ پردیش کے ہائی کورٹ کے جج کے لیے طے ہوگیا تھا۔ صرف رسمی احکامات جاری ہونے کی دیر تھی...... یہ تحریک ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی تھی اور جناب پی سی سیٹھی نے بخوشی قبول کرتے ہوئے اسے فوراً عملی جامہ پہنا دیا تھا...... لیکن کسی اور نے نہیں بلکہ اختر بھائی کے ہی کچھ کامریڈ دوستوں اور ترقی پسند تحریک علمبردار ہم سفروں، نے اختر بھائی کے خلاف یہ مہم چلائی کہ وہ تو ایک خطرناک قسم کے کمیونسٹ ہیں انھیں ہائی کورٹ کا جج بنانا انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے......

وزیر اعلا سیٹھی صاحب پر جب ان اوچھے واروں کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اور ذرائع

تلاش کیے گئے اور سنجے گاندھی تک یہ مہم پہنچائی گئی۔ سنجے گاندھی پر اس زمانے میں کمیونزم کا ہوّا سوار تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے اختر بھائی ہائی کورٹ کیسے پہنچتے........ جناب پی سی سیٹھی نے بھوپال کے دوستوں کی یہ مہربانیاں اور وضع داری دیکھتے ہوئے بھوپال والوں پر تین بار لاحول پڑھی اور معاملہ ختم........

لیکن اس واقعے کے بعد بھی میں نے اختر بھائی کے ماتھے پر کوئی شکن نہ دیکھی اور جن مہربان دوستوں نے یہ سب کچھ کیا تھا... سب کچھ جاننے کے بعد بھی اختر بھائی ان لوگوں سے بدستور اسی اخلاق و محبت سے ملتے رہے اور کبھی انھیں یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کی "مہربانیوں" کو جانتے ہیں.....

لیکن چھ دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد ہونے والے واقعات نے انھیں توڑ سا دیا ہے ..... اپنے خوابوں کے بھوپال کی یہ حسرت ناک اور بدنما تعبیر ان سے برداشت نہیں ہو پا رہی ہے .... صوبائی حکومت اور پولیس کی منصوبہ بند سازش فرقہ وارانہ فساد نہیں بلکہ ایک مخصوص فرقہ کی نسل کشی ہے ...... ایسی ہی نسل کشی جو ویتنام میں کی گئی۔ فلسطین میں کی گئی۔ الجیریا میں کی گئی۔ ساؤتھ افریقہ میں کی گئی...... ہٹلر کے جرمنی میں کی گئی...... جس کے لیے مرکزی حکومت بھی اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

یہ وقت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ تقریباً نصف صدی پہلے

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی

یا

بند رکھو گے دریچے دل کے یارو کب تلک
کوئی دستک دے رہا ہے اٹھ کے دیکھو تو سہی

جیسے اشعار کہنے والا شاعر آج کی نسل سے مایوس ہو کر زندگی سے دلچسپی کھو بیٹھا ہے ...... مگر میں اس منفرد شاعر۔ ادیب۔ دانشور اور مقرر کو آواز دے رہا ہوں جسے میں نے سڑکوں پر جھنڈا اٹھائے جلوس کی رہنمائی کرتے دیکھا ہے اور اپنے کلام سے مشاعرے لوٹتے بھی..... جسے میں نے لاتعداد جلسوں میں اپنی تقریر کا جادو جگاتے بھی، دیکھا ہے اور عدالت میں لوگوں کے مقدمات کی پیروی کرتے بھی اور میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر آپ کو جھنڈا اٹھانا پڑے گا۔ ایک بار پھر آپ کو قلم اٹھانا پڑے گا...... ایک بار پھر آپ کو نئی نسل کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنا ہوگا...... تاکہ انسان دشمن ان فرقہ پرست طاقتوں کو مل جل کر شکست فاش دی جا سکے اور ایک نئے کل کی بنیاد رکھی جا سکے۔ ورنہ یہ سارا ہندستان خون۔ آنسوؤں اور آگ کے شعلوں میں غرق ہو جائے گا......

اختر سعید صاحب آپ کو زندہ رہنا پڑے گا اور اپنی پوری طاقت سے پکار کر یہ کہنا ہوگا۔

ہمصفیرانِ چمن مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہوگی

اور اس کے علاوہ میں کروں بھی کیا........یہ کمبخت بھوت.......یہ آوازیں پیچھا بھی تو نہیں چھوڑتے.......میں ان سے بھاگنا چاہتا ہوں، مگر ان سے بچ کر بھاگ بھی نہیں سکتا......کیا کوئی ہے جو مجھے ان سے بچا سکے؟......

اختر سعید خاں اہل علم کی نظر میں

۱۔ کمال احمد صدیقی

اختر سعید خاں، مدھیہ پردیش ہی کے نہیں، اس ملک کے ان شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے سلاست روی کے ساتھ، اپنے اسلوب کو قائم رکھا ہے یہ بات اپنے میں نہ کوئی بہت اچھی بات ہے اور نہ بری۔ غزل کا ایک خاص لہجہ اور الفاظ کا دروبست جو ایک ایسے اسلوب کی صورت گری کرتا ہے جس میں آپ بیتی بھی کسی حد تک ماورائیت کو خود میں سمولیتی ہے، احساسات اور جذبات ہوتے تو ذاتی ہیں، لیکن اس طرح ان کا اظہار کیا جاتا ہے گویا شاعر ان میں شریک ہوتے ہوئے بھی ایک مبصّر ہے، یہ ہے اختر سعید خاں کا وہ اسلوب جسے اس عہد میں کامیابی کے ساتھ جگر مرادآبادی اور مجروح سلطان پوری نے نبھایا ہے۔ اختر سعید خاں اپنی ذات میں اور اپنی شاعری میں، جوش ملیح آبادی کے اس مقطع کی تشریح معلوم ہوتے ہیں۔

طبیعت خوش ہوئی اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

یہ "اگلی شرافت" ایک ایسا تصوّر ہے جو جاگیردارانہ معاشرت اور اس کے نظامِ اقدار سے جڑا ہوا ہے۔ اختر سعید خاں کے یہاں یہ "اگلی شرافت" صرف رکھ رکھاؤ اور تلخ بات کو گوارا طریقے سے کہنے تک محدود ہے، ورنہ ذہنی طور سے انھوں نے نہ صرف جاگیرداری اور اس کی وارث سرمایہ داری کے نظام اقدار کو ٹھکرایا ہے۔ بلکہ اپنے مخصوص لہجے میں ایک صالح معاشرے سے جو مستقبل میں آئے گا، آس لگائی ہے۔ ہمارا معاشرہ جس مرحلے میں ہے اس میں شاعر اپنی افتادِ طبع اور صواب دید سے تین میں سے ایک رویّہ چن سکتا ہے۔ سماج جیسا بھی ہے اس میں رہنا ایک سعادت سمجھے اور اس کی بقا چاہے۔ دوسرا رویّہ یہ ہو سکتا ہے کہ سماج کی ناانصافیوں کو ختم کرنے کے لیے گزرے ہوئے زمانہ میں جانا چاہیے۔ تیسرا رویّہ یہ کہ اس سماج کو اس طرح بدلنا چاہیے کہ نیا معاشرہ سب کو برابر کے حقوق دے

اور کسی کو دوسروں کی محنت کا استحصال کرنے کی اجازت نہ دے۔ یہ حقوق صرف آئین میں درج نہ ہوں بلکہ عملی زندگی میں سب کو میسر ہوں۔ اختر سعید خاں تیسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی شاعری، اس ذہنی رویے کے باوجود ادب کے طبقاتی کردار کی ایک مثال ہے۔ یہ تضاد اس عہد کی اردو شاعری کا ایک خاصہ ہے اور اس تضاد کے گرداب میں وہ شاعر بھی پھنس گئے ہیں جو دو ٹوک بات روبرو کہنے کی وجہ سے ادب کے افق پر نمودار ہوئے تھے۔

اس مجموعے میں غزلوں کے ساتھ تاریخیں نہیں دی گئی ہیں، اس وجہ سے اشارے، کنایے اور علامتیں سمجھنے میں دشواری یوں ہوتی ہے کہ مضمون بہت واضح طور سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے باوجود شعریت سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے ؎

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ان کی ہے، مگر صبح ہماری ہوگی

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے مہر اور صبح آزادی کی علامتیں تھیں اور رات غلامی کی۔ آج ان علامتوں کے معنی بدل گئے ہیں ؎

ہمصفیران چمن، مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں، خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہوگی

بادِ بہاری بھی ایک علامت ہے جو آئے گی تو ماحول کی گھٹن دور ہو گی۔ یہ WIND OF CHANGE کو آواز دی جا رہی ہے اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ایک آواز سے کچھ نہیں ہوگا، سب مل کر آواز دیں، اپنے مشترکہ عمل سے معاشرہ بدلیں۔

کل اس زمیں پہ اتریں گے پھولوں کے قافلے
اک پیکرِ بہار کی آوازِ پا ہیں، ہم

جو بات پہلے مہر، ظلمات، صبح اور رات کی علامتوں اور تلازموں میں کہی گئی تھی، وہ پھولوں اور بہار کے تلازمے میں کہی گئی ہے لیکن یہ صرف تلازمے کا شعر نہیں ہے بات کہی ہے اور اگرچہ "خاص" کے اسلوب میں کہی ہے لیکن بالواسطہ طریقے سے دو ٹوک بات کہی ہے کہ جو نظام آنے والا ہے وہ سب کے لیے مجسّم بہار ہے۔ سب کے لیے اس میں فرحت تازگی اور خوشی ہے۔ "ہم"، اس کی آوازِ پا ہیں، اس کے نقیب ہیں، اس کے پیش رو ہیں۔

یقیں ہے نہ گماں ہے ذرا سنبھل کے چلو
عجیب رنگ جہاں ہے ذرا سنبھل کے چلو

یہ غزل ۱۹۴۷ء یا اس کے دو ایک برس بعد کی ہے۔ اس پُر آشوب دور میں، جب اچھے اچھوں کے نظریے ڈگمگا گئے تھے اور جمہوریت کے پرستاروں نے آمریت کے

آگے گھٹنے ٹیک کر قصیدے پڑھنا شروع کر دیے تھے، تو اس وقت اردو کے صرف چند ادیبوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ کھُل کر بات کرنا، اس وقت ممکن بھی نہیں تھا اور اختر سعید خاں یوں بھی اس اسلوب سے بہت دور ہیں جو "جذبے کی تہذیب" کو کوئی بہت بڑا وصف نہیں سمجھتا۔ اس پس منظر میں دیکھیں تو ان کی یہ غزل شہر آشوب نہیں ایک "ملک آشوب" ہے۔

سلگتے خوابوں کی بستی ہے رہگزارِ حیات
یہاں دھواں ہی دھواں ہے ذرا سنبھل کے چلو
روش روش ہے گزرگاہ نکہت برباد
کلی کلی نگراں ہے ذرا سنبھل کے چلو
جو زخم دے کے گئی ہے ابھی نسیم سحر
سکوت گل سے عیاں ہے ذرا سنبھل کے چلو
خرام ناز مبارک تمھیں مگر یہ دل
متاعِ شیشہ گراں ہے، ذرا سنبھل کے چلو

"نگاہ" ان لوگوں کے لیے تو ایک یادگار تحفہ ہے جو غزل کا کلاسیکی روایات میں رچا بسا ہونا، غزل کا اسلوب سمجھتے ہیں۔

۲۔ محمد احمد سبزواری

مجھے بڑی خوشی ہے کہ برصغیر میں آزادی کے بعد ابھرنے والے شاعروں میں تمھارا شمار صف اوّل کے شعرا میں ہوتا ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تم نے اپنی علاحدہ شناخت قائم رکھی ہے۔ تمھارا ہر شعر اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ میں اختر سعید کے دل کی آواز ہوں۔ تمھاری غزل میں روایت بھی ہے اور جدّت بھی، شعور بھی ہے اور سرور بھی، خلوت بھی ہے اور جلوت بھی، احساس بھی ہے اور عزم و حوصلہ بھی، ان مختلف اجزا کے امتزاج نے تمھارے کلام کو منفرد حیثیت دے دی ہے۔

مثال کے طور پر تغزل کے یہ شعر کس قدر خوبصورت اور اچھوتے ہیں:

قیمتِ دل کا مجھے اندازہ کچھ ہو تو سہی — پھر چرالینا نگاہیں پہلے دیکھو تو سہی
روٹھ جاتے تو منانا کوئی دشوار نہ تھا — وہ تعلق ہی نہ رکھیں تو منائیں کس کو

خبر کیا تھی کہ دل کی ایک اک رگ ٹوٹ جائے گی
بظاہر کس قدر معصوم تھیں انگڑائیاں تیری

کچھ اس ادائے کرم سے ہٹائیے دل کو — کہ یہ غریب زمانے میں سرخرو تو رہے

بلند حوصلگی اور عزم و اعتماد کی منزل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔

وہ ہمیں تھے جو اجل سے نہ دبے کہیں دبائے — تہِ دادِ گنگنانے، سرِ دار مسکرائے

یہ رہا مرا نشیمن، کوئی آنکھ تو اٹھائے
کبھو آندھیوں سے آئیں، کبھو برق سے جلائے

بلندی خود ہمارے سامنے خم ہے جہاں ہم ہیں
بلندی سے ہماری سمت ہنس کر دیکھنے والو

اس مجموعے میں تاریخ و سال کا ذکر نہیں جس سے حالات کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا۔ لیکن متعدد اشعار بالخصوص ذیل کے اشعار کے پس منظر میں مجھے بے شمار داستانیں اور ان کہی کہانیاں بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

پوچھتا کس سے کہ میرے گھر میں کیا تھا کیا رہا
اک سلگتا آشیاں اور بجلیوں کی انجمن

زخم ہم اپنے دکھائیں تو دکھائیں کس کو
کوئی پرسانِ وفا ہے نہ پشیمانِ جفا

کچھ علاج ان کا بھی سوچا تم نے اے چارہ گرو
وہ جو دل توڑے گئے ہیں دلبری کے نام پر

کہ گلوں کی بات پوچھے نہ کلی کو گدگدائے
وہ ہزار فصلِ گل ہو مگر اس طرح نہ آئے

آن بیٹھے ہیں تو رسم ورہِ دنیا ہی سہی
رہنے والے ہیں اسی شہر کے ہم بھی لوگو

یہ کیا ارم ہے کہ ہنستے ہیں جس پہ ویرانے
یہ کیا چمن ہے کہ اک پھول پر بہار نہیں

''در رسول،، والی نعت بھی بہت خوب ہے اور اس کا آخری شعر تو لاجواب ہے۔ کہتے ہیں کہ ترقی پسند اسلام دشمن ہیں۔ ان میں روحانیت موجود نہیں، وہ ہر شے کو مادی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، ان معترضین کو تمھاری یہ نظم بار بار پڑھنی چاہیے۔ تاکہ وہ بھی ان شراروں کی حرارت کو اپنے دلوں میں محسوس کر سکیں جو ایک ترقی پسند کے محسوسات ہیں۔ بنیادی طور پر تو ترقی پسند بھی ایک انسان ہے مگر اس کا مخصوص ذہنی رویّہ ہے۔ وہ رنگین شیشوں کی عینک سے دنیا، یہاں کی رہنے والی مخلوق اور ان کے مسائل کو دیکھنے کا عادی نہیں بلکہ اسلام نے جس عظمتِ انسانیت، مساوات رواداری اور صداقت کے ساتھ تہذیب نفس کی تعلیم دی ہے، وہی اس کا اوّلین علم بردار ہے اسلامی تعلیمات کو کسی بھی زمانے کے مسلمانوں کے طرزِ عمل سے مخلوط نہیں کرنا چاہیے۔

۳- عتیق اللہ

آپ کو میں نے ہمیشہ دوسروں سے بڑی حد تک مختلف پایا ہے۔ وہ شیفتگی و شگفتگی، نرمی و سلاست، ضبط و انضباط جو آپ کی شخصیت کی پہچان ہے، وہی آپ کی غزل کا بھی خاصہ ہے۔ اس میں کلاسیکی رچاو ضرور ہے۔ روایتی پن نہیں ہے۔ دل کو چھو لینے والا ٹھہراو، خاموش کلامی کا سا تاثر، آہستہ روی جیسی کیفیت اور پھر شعور انگیز سناٹوں سے مملو تاثرات جیسے تجربات آپ کی غزل معمور ہے۔ یہ فسانہ جان فسانہ جہاں بھی ہے۔ زخم زخم مگر حوصلہ آثار۔ وہ غزل جو جینے کا درس دیتی ہے، جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔

قمر ساحری

بھوپال کے قدآور اور آبرومند شاعر اختر سعید خاں بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن غزل نگار کے طور پر ان کے فکر و خیال، خود بینی یا مرقع نویسی کے تنگ و تاریک حصار میں محصور نہیں ہیں بلکہ کھلی اور لامحدود فضا کی مشاہدہ نگاری سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ١٩٣٦ء کے بعد اردو شاعری میں جو عصریت نگاری، جرأت مندی اور حقیقت بیانی آئی، اس کے نمایاں اثرات اختر سعید خاں کی غزلوں میں نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے ظالم قاتلوں کو پہچانتے ہیں اور انھیں للکارنے اور اس عہد کے ہر زخم کا حساب طلب کرنے کی جرأت بھی رکھتے ہیں۔ ١٩٤٧ء کے بعد جو حالات رونما ہوئے اس سے وہ مطمئن یا مایوس نظر نہیں آتے بلکہ اپنے خوابوں کی صورت گری کے لیے آج بھی کانٹوں بھرے راستوں پر رواں دواں ہیں۔ قاتل اور آبلہ پائی کے الفاظ ان کے کلام میں زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ انھی دو لفظوں میں آج کے ظالم و مظلوم کا حساب کتاب پوشیدہ ہے۔ ان کے فکر و اسلوب سے ان کی عوام دوستی اور وطن پرستی کے جذبوں کی حرارت کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری (نگار ١٩٥٦)

"بھوپال کے موجودہ شعراء کی فہرست کافی طویل ہے اور یہ کہنا غالباً غلط نہیں ہوگا کہ ان میں کم ایسے ہیں جن کا کلام قابلِ توجہ نہ ہو۔ لیکن جدید رجحانات اور زندگی کی نئی اقدار کے احساس کے ساتھ حسنِ تغزل اور والہانہ لب و لہجہ کے لحاظ سے ان سب میں اختر سعید خاں کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ کافی تفصیل کی محتاج ہے۔"

شمع زیدی

اختر سعید خاں سے ملاقات

"اختر صاحب، بعض شعرا کی طرح آپ کو نقادوں کی جانب سے نظر انداز کیے جانے پر کوئی شکایت تو نہیں ہے" میں نے ہندستان کے ترقی پسند اور ممتاز شاعر جناب اختر حسین خاں صاحب سے سوال کیا۔ چند ساعتیں گزر جانے کے بعد انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میرا ایسا کوئی کارنامہ ہی نہیں ہے جس پر مجھے نقادوں کی جانب سے نظر انداز کیے جانے کا گلہ ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ جو لوگ نقاد کے کاندھے پر سوار ہو کر اپنے قد کو بلند کرنا چاہتے ہیں میرے خیال سے وہ اپنے فن میں سچے نہیں ہوتے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے بہت سے نقاد دانستہ ان بہت سے شعرا اور ادبا کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن پر انھیں لکھنا چاہیے۔ لیکن کسی ناقد کے کسی کو بڑھا دینے یا اس کے بارے میں چند اچھے کلمات لکھ دینے سے نہ اس کی شاعری کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ کمی اور ناقد تخلیق کار کے پیچھے چلتا ہے جب کوئی چیز تخلیق نہیں ہو گی تو تنقید کیسے ہو گی؟ یوں بھی شاعری کو سمجھنے اور اس پر تنقید کرنے کے لیے ایک اور شاعر کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ ہمارے یہاں تنقید اس نقطۂ نگاہ سے نہیں کی جاتی۔"

اختر صاحب کی یہ بات سن کر ہمیں اسکاٹ جیمس کی بات یاد آجاتی ہے وہ اپنی کتاب "ادب کی تشکیل نو THE MAKING OF LITERATURE میں ایک جگہ نقاد کے حوالے سے یہ کہتا ہے کہ "ایک سرے پر ایک آواز ہوتی ہے اور دوسرے سرے پر ایک سننے والا" یعنی کہنے والا شاعر اور سننے والا نقاد / اور یہی بات مجنوں گورکھپوری صاحب بھی کہتے ہیں "اصلی کارنامہ تو شاعر کا ہے جس نے شعر کی تشکیل کی لیکن اگر نقاد میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس شعر کی اندرونی کائنات اور بیرونی ہیئت کا تجزیہ کر کے اس کو از سر نو ویسی ہی شکل دے سکے جیسی کہ شاعر نے دی ہے تو وہ نقاد کا اصلی فرض ادا کرنے سے قاصر رہ جائے گا۔"

لیکن اس سے قبل کہ گفتگو مزید آگے بڑھے میں اختر صاحب سے یہ

جاننے کی خواہش مند ہوں کہ انھوں نے اپنی ذات کی تسکین کے لیے شعر ہی کا انتخاب کیوں کیا۔ تاکہ ان کی شخصیت اور شاعری کے پیچھے کارفرما عوامل کو سامنے لایا جاسکے۔ چنانچہ میں نے ان سے پہلا سوال کچھ اس طرح کیا۔

• آپ نے شاعری کا انتخاب کیوں کیا؟

" ہمارا تعلق بھوپال سے ہے،، غالباً بھوپال کا حوالہ انھوں نے اس لیے دینا ضروری سمجھا کہ وہ شعروادب کا مرکز رہا ہے پھر بات کا سلسلہ اس طرح آگے بڑھا۔ گھر کا ماحول بھی شعروشاعری کا تھا والد اور تایا شعر کہتے تھے میرا بھی دل چاہا کہ شعر کہوں چنانچہ جس طرح ہمارے سبھی شعرا کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے اسی طرح میری ابتدا بھی غزل سے ہوئی ہے مگر ۱۹۴۰ء میں جو میں نے اشعار کہے وہ کچھ اس قسم کے تھے کہ

آغوشِ موجِ بحر زہے رفعتِ نصیب
مرجایئے پلٹ کے نہ ساحل کو دیکھیے

• کچھ یاد ہے پہلی غزل کب شائع ہوئی تھی؟

"۱۹۴۱ء میں،، انتہائی مختصر جواب دیا۔

• اپنے کلام پر کسی سے اصلاح لینے کے متعلق اختر سعید صاحب نے کہا، میں نے باقاعدہ اصلاح تو کسی سے نہیں لی۔ البتہ استفادہ سب سے کیا اور کسی نے مشورہ دیا تو اسے قبول بھی کیا

• اپنے والد حامد سعید خاں کے بارے میں اختر سعید صاحب کہتے ہیں،، وہ بھوپال کے ممتاز اور نمایاں غزل گو شاعر تھے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے غزل کا جو پرانا رنگ تھا (یعنی امیر اور داغ کے شاگردوں نے جس رنگ کی غزل کا رواج دیا تھا) اس سے غزل کا دامن چھڑایا اور اصغر، فانی، حسرت اور جگر جس انداز کی شاعری کررہے تھے اس کو بھوپال میں رواج دیا،،

علامہ اقبال کے حوالے سے اختر صاحب نے کہا،، یہ تو فخر حاصل نہیں ہوسکا کہ علامہ اقبال ہمارے مہمان ہوتے لیکن بھوپال میں ان کا قیام طویل عرصے تک رہا۔ اہل بھوپال بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے لیکن وہ ان دنوں علیل تھے اس لیے بھوپال کے لوگ ان سے کوئی خاص استفادہ نہیں کرسکے لیکن ان کی شاعری کا جو شہرہ تھا اس کی عظمت سے اہل بھوپال بے خبر بھی نہیں تھے،،

• ابتدا میں جب آپ نے شعر کہنے شروع کیے تو اس وقت شاعری کے لیے ماحول کیسا تھا اور آپ نے کن لوگوں کو مشاعروں میں سنا؟ انھوں نے کہا۔

،، جب میں نے شعر کہنے شروع کیے تو اس وقت بھی بھوپال میں غزل کا چرچا

تھا طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ پھر بھوپال ہی میں میرے ہوش سنبھالنے تک بہت بڑے مشاعرے ہوئے جن میں ہندستان کے سبھی سربرآوردہ اور ممتاز شعراشرکت فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً جوش، جگر، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، سیماب اکبرآبادی اور احسان دانش وغیرہ، ان کی شہرت، عظمت اور پھر جس طرح ان کی پذیرائی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بہت متاثر کیا اور شعر کہنے کی جانب مائل کرنے میں ان کی شاعرانہ عظمت و شہرت کا بھی دخل ہے۔" انھوں نے بہت سچائی سے اس کا اعتراف کیا۔

● جس طرح ہر شعر کہنے والے کی شاعری میں اس کا کوئی بنیادی مسئلہ ہوتا ہے اس طرح اختر صاحب کے یہاں شاعری میں بنیادی مسئلہ ایک بہتر زندگی کا تصور ہے میں ان سے پوچھتی ہوں شاعری کے کس اسکول سے آپ کا تعلق ہے؟ تو وہ جواب دیتے ہیں۔

"میں نے ۱۹۴۷ء سے شعوری طور پر ترقی پسند ادب کو اپنی شاعری اور تحریر کا مرکز بنایا"

ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے اردو ادب میں کنٹری بیوشن پر بات کرتے ہوئے اختر صاحب نے کہا" ان کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے نثری اور شعری ادب کا دامن محض تصورات اور تخیلات سے چھڑالیا اور اس کا رشتہ زمین سے جوڑ دیا بلکہ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ زمین کے سینے سے لگ کر چلنا سکھایا۔ شاعری، افسانے اور دوسرے اصناف ادب میں وہ احساسات پیدا کیے جو زندگی سے قریب تر تھے اور جن کا ہمارا سماج متقاضی تھا جن سے ہمارے شعرا بے خبر تھے۔ یا اسے درخور اعتنا نہ سمجھ کر آنکھیں چرائے ہوئے تھے۔ ترقی پسند ادب نے ان تمام موضوعات کو اپنی گرفت میں لے کر ایک سماجی ضرورت کو پورا کیا اور اس حد تک پورا کیا ہے کہ اب کوئی بھی شاعر یا ادیب اپنے آپ کو غیر ترقی پسند کہلانا پسند نہیں کرتا۔ گویا ترقی پسند ادب نے انسانوں کو زندگی کی طرف دیکھنے کا ایک رویّہ دیا ہے۔ اور یہ ترقی پسند ادب کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔"

● ترقی پسند شاعر اور غزل کے حوالے سے ایک سوال یہ ہے کہ مجروح صاحب کہتے ہیں "رسن و دار" اور "فراز دار" کے الفاظ سب سے پہلے انھوں نے اپنے یہاں استعمال کیے اور اسے رواج دیا۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ (واضح رہے کہ اس انٹرویو کے وقت مجروح صاحب بھی موجود تھے)

"دیکھیے! یہ الفاظ جو ہمیں ملے ان کی روایت تو پرانی ہے" اس وقت ان کے لہجے میں بے حد ٹھہراؤ تھا وہ کہہ رہے تھے "میں اس سلسلے میں آپ کو غالب کا ایک شعر

سناتا ہوں

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمایش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے

لیکن ان شعرا نے جس نقطۂ نگاہ سے ان لفظوں کو برتا تھا وہ ظاہر ہے اس طبقاتی شعور کے ساتھ ان کے یہاں نہیں آئے تھے جس طبقاتی شعور کے ساتھ مجروح صاحب کے کلام میں پہلے پہل نظر آئے۔ بلکہ ان کا گہرا اثر بھی ہماری نئی غزل پر پڑا۔" انھوں نے نئی غزل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا،" میں نئی غزل آج کی نئی غزل کے معنوں میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ غزل بھی جس وقت کہی گئی اس وقت نئی تھی جن موضوعات کو اس عہد کی غزل نے اپنے دائرے میں لیا وہ موضوعات ہمارے کلاسیکل شعراء اپنی شاعری سے ذرا دور ہی رکھتے تھے مگر جب مجروح صاحب کی شاعری میں یہ تصورات نظر آئے اور لوگوں نے انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا تو مجروح صاحب کے بعد آنے والوں نے جن میں آپ میرا نام بھی شامل کر سکتے ہیں ہم نے ان نظریات لفظیات اور خیالات کو شعوری طور پر قبول کیا،،

ہم عصر شعرا کے سلسلے میں اختر صاحب کہتے ہیں،" پانچ دس سال کے فرق سے آنے والوں کو معاصرین میں شمار کیا جا سکتا ہے مثال کے طور پر فراق صاحب کے چند سال بعد جو غزل میں نمایاں نام نظر آتا ہے وہ فیض صاحب کا ہے ان کے بعد مجروح صاحب کا نام آیا اور پھر ہندستان و پاکستان کے دوسرے شعرا کے نام آئے ہیں اور عہد کے تعین کے لیے ان کی عمروں کے لحاظ سے ہم ان کا اندازہ کر سکتے ہیں لہٰذا میرے پیش نظر ان ہی لوگوں کا کلام تھا لیکن اس موقع پر میں یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ جب میں نے شعر کہنے شروع کیے تو جگر صاحب کا شہرہ سب سے زیادہ تھا جس طرح ان سے پیشتر کے شعراء پر امیر اور داغ چھائے ہوئے تھے اسی طرح میرے عہد کے شعراء پر جگر، فانی اور اصغر کے اثرات تھے اور ان سب میں اگر کوئی شخص اپنے والہانہ انداز اور خوش گوئی سے مشاعروں کو لوٹ رہا تھا تو وہ صرف جگر مرادآبادی تھے۔

ایک اور سوال کے جواب میں اختر صاحب کہتے ہیں۔ فانی یا جگر صاحب کے جن شعروں پر ہم سر دھنا کرتے تھے اب صرف کبھی کبھی ذہن میں گونج اٹھتے ہیں ورنہ ان کا اثر باقی نہیں ہے جہاں تک میرا تجربہ ہے اب تو اثرات ان ہی اشعار کے ہیں جو زندگی میں ہماری رفاقت کا حق ادا کرتے ہیں ہمارے ساتھ ہنستے اور آنسو بہاتے ہیں۔ جو دل میں کوئی امنگ پیدا کرتے ہیں۔ کوئی جذبہ و خیال یا ذہنی افق عطا کرتے ہیں اور جو زندگی کی مختلف کیفیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں،،

ہندستان کے ادبی ماحول کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اختر صاحب نے بتایا،" ہندستان کے ادبی ماحول کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک حصّہ لکھنے

والوں کا، دوسرا حصہ پڑھنے والوں کا ہے اور جہاں تک لکھنے والوں کا تعلق ہے وہ پھر دو حصّوں میں بٹا ہوا ہے یعنی نثر اور نظم۔ اور پڑھنے والوں کے بھی دو گروہ ہیں ایک تو وہ ہے جو کتابوں اور رسالوں کے ذریعے پڑھتے ہیں اور دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو مشاعروں میں جاکر شعر سنتے ہیں کیونکہ سننے اور پڑھنے دونوں کا تعلق زبان سے قریب تر ہے اور زبان کے پیرایوں، محاوروں اور رموز و علائم سے ہے لیکن بدقسمتی سے ہماری نئی نسل جو ہندستان میں ان تیس برس میں پروان چڑھی ہے وہ ہماری زبان کے پیرایوں، محاوروں اور شعر و ادب کے رموز علائم سے دور ہوگئی ہے اس لیے ہمیں شعر پڑھتے وقت یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہ اسے پورے طور پر سمجھ بھی رہے ہیں یا نہیں؟"

آپ کے خیال میں اس دوری کا قصوروار کون ہے؟ یا اس سے دوری کا کیا سبب ہے؟

"ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ کچھ تو دوری اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ اردو زبان سے معاشں کا رشتہ ٹوٹ گیا سوائے چند اساتذہ کے جو اردو میں تعلیم دیتے ہیں بقیہ طبقہ اردو زبان کو ذریعہ معاشں نہیں بنا سکتا اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اردو والوں نے بھی کچھ اپنی طرف سے تھوڑی سی غفلت اور لاپروائی برتی ہے وہ اپنے گھروں میں اردو زبان کی اس طرح حفاظت نہیں کر رہے ہیں جس طرح ہندی کی حفاظت اس دور میں ہوئی جب ہندستان میں ہندی زبان کا چلن اتنا نہیں تھا جتنا اردو، فارسی اور انگریزی کا۔ مگر ہندی زبان کے پرستاروں نے اس کو اپنے گھروں میں محفوظ رکھا، اس رسم الخط کو محفوظ رکھا جس کا چلن دفتروں، عدالتوں اور بازاروں میں نہیں تھا۔ اگر ہم بھی یہی عمل کریں تو اردو محفوظ رہ سکتی ہے اور میں ہندستان میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے ایک وقت آئے گا جب زبانوں کے تعلق سے تعصّبات کے بادل چھٹیں گے اور زبانیں ترقی کریں گی۔"

ذرائع ابلاغ کے کردار پر بات کرتے ہوئے اختر صاحب نے تاسف سے کہا، "ذرائع ابلاغ کی آسانیاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ جن لوگوں کے کلام کو ہرگز شائع نہیں ہونا چاہیے ان کو بھی اکیڈمیاں شائع کر رہی ہیں جن کے ساتھ کوئی تعاون نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے ناول، افسانوں کے مجموعے اور شعری کلام کی اشاعت کے لیے تعاون ہو رہا ہے جبکہ ریڈیو کی پالیسی یہ ہے کہ وہ معیار کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ ان کے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہتی ہے کہ کس نشست میں کون شاعر یا ادیب رہ گئے ہیں جنھیں آیندہ بلایا جائے؟ البتہ پچھلے پندرہ بیس سالوں میں جو تبدیلی آئی ہے اس میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں کو

کو کچھ سہولتیں حاصل ہو گئی ہیں،،

ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے جو ایوارڈ ادیبوں اور شاعروں کو دیے جاتے ہیں، مجروح صاحب ان سے مطمئن نہیں ہیں آپ یہ بتائیے کہ کیا آپ کے خیال میں یہ ایوارڈ ایمانداری اور دیانت داری سے دیے جاتے ہیں؟

اختر صاحب مسکراتے ہوئے کہتے ہیں ،، جب ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے مجھے ایوارڈ مل جائے گا تو پھر میں بتا سکوں گا کہ ایمانداری سے ایوارڈ دیے جاتے ہیں یا نہیں؟،،

غالباً اختر صاحب اس معاملے میں کچھ بتانا نہیں چاہ رہے تھے میں نے ان سے دوبارہ سوال کیا جنھیں اب تک یہ ایوارڈ ملے ہیں کیا آپ ان سے مطمئن ہیں؟

وہ جواب دیتے ہیں ،، کبھی کبھی ہم دوسروں کے سلیکشن سے مطمئن نہیں ہوتے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم صحیح سوچ رہے ہیں بلکہ ممکن ہے ان لوگوں نے ٹھیک سوچا ہو۔ کیونکہ اس میں بھی بالآخر وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہم سے بہتر لکھنے والے اور زیادہ بہتر سوچنے والے ہیں۔ اور اب جہاں تک سفارشوں کا تعلق ہے ایک دوسرے کے بارے میں تو رائے کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور سبھی زبانوں میں یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی دوستوں کا خیال کر لیا جاتا ہے،، میرا خیال ہے اس جواب میں پہلے سوال کا جواب بھی موجود ہے۔

ہندستان میں اردو کی ترویج کے لیے ابلاغ عامہ کے کس ذریعے سے مدد لی جا سکتی ہے یا اس کی ترقی کے لیے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہیں؟

انھوں نے کہا،، بنیادی بات یہ ہے کہ اردو کے رشتے کو معاش سے جوڑا جائے، اردو بولنے والے کی معقول تعداد ہے اس لیے کوئی بھی شخص معاش سے اس لیے محروم نہ رکھا جائے کہ وہ اردو جانتا ہے تو اسے معاشی سہولتیں نہیں مل سکتیں۔ جب کسی زبان کو سرکاری سطح پر تسلیم کر لیا جاتا ہے تو اس کو سیکھنے والا اس نقطۂ نگاہ سے بھی سیکھتا ہے کہ ایک تو میری اپنی زبان ہے دوسرے تہذیبی سرمایہ ہے اور تیسری اہم بات یہ کہ معاش کا وسیلہ بھی ہے چنانچہ اگر یہ تینوں باتیں کسی زبان میں پیدا ہو جائیں تو ہر شخص اسے سیکھنے کی کوشش کرے گا،،

اختر صاحب نے بتایا،، ہندستان میں اردو بورڈ زیادہ کام کر رہا ہے اور اس میں جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ کلاسیک کو دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے اور دوسری زبانوں کے ادب کے اچھے اچھے ترجمے شائع ہو رہے ہیں یہ سب کام ہمارے لیے باعث اطمینان ہے،،

جس طرح پہلے مشاعروں سے شاعر اور سامع کی تربیت ہوتی تھی ویسا ماحول اب مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ شعرا کے معاوضہ لے کر پڑھنے اور سامعین کی جانب

سے فرمایشی غزلیں سنانے پر اصرار کرنے کا رواج تو اب اس قدر عام ہوگیا ہے کہ مشاعرے رفتہ رفتہ اکھاڑے کا روپ دھارتے جا رہے ہیں۔ میں نے اختر صاحب سے کہا آپ کے ذہن میں اس کے سدھار کی کوئی صورت ہے؟

وہ کہتے ہیں "میرے خیال میں سننے والوں کی تربیت کے لیے مشاعروں کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا پڑے گا ایک مشاعرہ وہ ہوگا جہاں شعرا اپنا کلام اس نقطۂ نظر سے پڑھتے ہیں کہ ہم اپنے کسی مشن کو پورا کر رہے ہیں یعنی جہاں شعرا کسی سیاسی پروگرام یا موضوعاتی پروگرام کو لے کر چلتے ہیں جس میں مقررین و سامعین کے ساتھ شعرا بھی ہوتے ہیں تو اس قسم کے مشاعرے جن کا تعلق عوام سے ہو الگ رکھنے چاہیں۔ اور جن مشاعروں کی محض ادبی حیثیت ہو (بے شک موضوعات سے دستبردار نہ ہوں) ان ادبی مشاعروں کو ان عام مشاعروں سے الگ رکھا جائے۔ تو شاعر اور سامع کی ذہنی تربیت ممکن ہو سکتی ہے"

اختر صاحب نے کہا "سماج کی جانب سے شعرا پر فرض ہی عاید نہیں ہوتا، بلکہ شاعر تو سماج کا ایک حصہ ہے اور وہ آج سماجی فریضہ انجام دے سکتا ہے میں اپنی دانست میں تو ساری زندگی یہ فریضہ انجام دیتا رہا ہوں کہ مجھ سے کم از کم اپنے اشعار میں کسی قسم کی غیر سماجی بات نہ سرزد ہو جائے"

شاعری میں نعرے بازی یا کسی خاص نظریے کی بات کرنے کے متعلق اختر صاحب صاحب نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا "کوئی شخص نعرہ لگا کر اظہار خیال کرتا ہے اور کوئی شخص پھول کی پتّی سے ہیرے کا جگر کاٹنا چاہتا ہے مثال کے طور پر ہمارے فیض صاحب کا فن ہی یہ ہے کہ وہ پھول کی پتّی سے ہیرے کا جگر کاٹتے ہیں" اختر صاحب کہہ رہے تھے۔ ہمارے عہد کے بہت سے شعرا بلند بانگ نعرے کی شاعری کرتے ہیں لیکن خود ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ بلند بانگ نعرے زیادہ دن تک ساتھ نہیں دے سکے۔ مثال کے طور پر جوشؔ صاحب کے بڑے اور اچھے شاعر ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟ مگر ان کی وہ باغیانہ شاعری جو انگریز کے زمانے میں تھی وہ بلند بانگ شاعری کہ جس میں انسان کو حرکت میں لانے کی پوری پوری طاقت موجود تھی وہ اس وجہ سے ہمارا ساتھ چھوڑ گئی کہ وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ شاعری اپنے عہد میں ضروری تھی اس لیے کہ اگر انسانی زندگی کی شادابی کے لیے شبنم ضروری ہے تو اس میں گرمی پیدا کرنے کے لیے شعلے کی بھی ضرورت ہوتی ہے"

موجودہ عہد کی شاعری کے حوالے سے اختر صاحب کہتے ہیں "موجودہ عہد میں تین طرح کی شاعری ہو رہی ہے ایک وہ جو کلاسیکل روایات کی پاسدار ہے۔ دوسری شاعری کسی سماج اور نظام کی نگرانی کے ساتھ ساتھ راستہ بھی دکھاتی ہے۔ اور تیسری شاعری وہ ہے جو نہ نظام سے تعلق رکھتی ہے نہ سماج سے اور نہ ہی ہمارا

زندگی سے اس کا تعلق ہے غرض ایک لاتعلق کی شاعری ہے جس کا نام آج کے دور میں "جدیدیت" ہے۔

اختر صاحب نے جدید شعرا کا نام لیے بغیر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "میں ہر شاعر کے بارے میں تو یہ دعوا نہیں کرسکتا کہ ان کا کلام میں نے پورا پڑھا ہے اور اگر پڑھا ہے تو اسے سمجھا بھی ہے کیونکہ آج کل شاعری کو پڑھنا ہی کافی نہیں ہے اسے سمجھنا بھی بے حد ضروری ہے۔ البتہ یہ ضرور عرض کرسکتا ہوں کہ وہ ساری شاعری جو زندگی سے لاتعلقی پر منحصر ہو ہمارا بہت دور تک ساتھ نہیں دیتی۔ ممکن ہے لمحاتی طور پر اس کی لفظیات یا کوئی چمکتا ہوا خیال ہمیں متاثر کرجائے لیکن جس طرح ہمارے کلاسیکل شعرا نے زندگی کی مختلف کیفیات کو بیان کیا اور ترقی پسند شعرا اور ادبا ہماری زندگی کی ترجمانی کرتے رہتے ہیں اور مستقل ہمارے دکھ اور خوشی میں ساتھ دے رہے ہیں اس طرح یہ شاعری ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی پھر آپ خود ہی بتایئے کہ جو شاعری ہماری زندگی، ہمارے سماج سے تعلق نہ رکھتی ہو ہم بھلا اس سے تعلق کیوں رکھیں؟"

- یہ فرمایئے کہ ایک شاعر کی زندگی میں نفرتوں اور محبتوں کا کتنا دخل ہوتا ہے؟

جواب ملا "نفرت کا بالکل نہیں۔ شاعر تو محبت ہی محبت ہے۔"

- کیا یہ نفرتیں، شاعر کی شاعری پر اثر انداز ہوتی ہیں؟

کہا گیا "بالکل اثر انداز ہوتی ہیں"

- کبھی کوئی ایسا موقع آیا جب آپ نے ان دونوں جذبوں کو اپنے شعر میں استعمال کیا۔؟

"نفرت کو تو نہیں استعمال کیا۔ مگر محبت کو بارہا استعمال کیا ہے" اس بار بھی انھوں نے مختصر سا جواب دیا۔

- کس موسم میں شعر کی آمد ہوتی ہے یا کس قسم کے موسم کو شعر کہنے کے لیے سازگار سمجھتے ہیں؟

کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "آمد کے بارے میں جو بہت سی روایات تھیں وہ اب ختم ہو گئی ہیں۔ اس لیے کہ آج کے دور میں ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے جبکہ پہلے شعرا سوائے شعر کہنے کے کچھ نہیں کرتے تھے۔ بڑے شاعروں پر ایک نگاہ ڈال لیجیے مثلاً میر تقی میر، شعر گوئی میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ انھوں نے کبھی بائیں باغ کی کھڑکی کھول کر نہیں دیکھی کہ وہاں کوئی باغ بھی لگا ہوا ہے اور غالب کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ صرف ایک بار نوکری کرنے گئے تھے (اینگلو عربک کالج میں فارسی پڑھانے) اور چونکہ اس کالج کے پرنسپل ان کے استقبال کے لیے نہیں آئے تھے اس لیے واپس آگئے کہ میں تو یہاں عزت کے

لیے آیا تھا مگر رہی سہی عزت بھی جا رہی ہے آج کے عہد میں بھی جگر اور جوش صاحب صرف شاعری کرتے تھے یا علامہ اقبال کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے سرہانے پنسل اور کاغذ رکھا رہتا تھا اور جب ان پر شعر گوئی کی کیفیت طاری ہوتی تھی تو وہ مستقل لکھتے رہتے تھے ممکن ہے ان تمام شعراء پر کسی خاص وقت شعر گوئی کی کیفیت طاری ہوتی ہو مگر آج کے دور میں ہم "آمد" کے لفظ کے بجائے "موڈ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور وہ موڈ کسی تحریک یا ماحول سے پیدا ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ دونوں چیزیں ذہن میں نہیں ہوتیں مگر شعر ذہن میں خود اپنے آپ کو گنگنانے لگتا ہے۔"

● آپ کی اس ساری گفتگو سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آج کل جو شعر کہے جا رہے ہیں تو اس میں شعوری کاوشوں کا دخل ہے؟"

وہ سوال مکمل ہونے سے قبل جواب دیتے ہیں "زیادہ تر"

● میں کہتی ہوں مگر شعر کے لیے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں شعوری کاوشوں کا دخل نہیں ہوتا بلکہ شعر دل سے نکلتا ہے۔

ان کا جواب تھا "جستہ جستہ تو ہو سکتا ہے مگر ہر وقت نہیں۔"

اختر صاحب کہتے ہیں "دوسروں کے اچھے اشعار پڑھ کر کبھی کبھی اپنے لیے یہ خیال ضرور آتا ہے کہ تم کیوں بکواس کر رہے ہو؟"

● کبھی آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ غزل میں جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کہہ چکے ہیں؟ میں نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

انھوں نے جواب دیا "ہر غزل کہنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ اس سے بہتر غزل کہی جا سکتی تھی اور اس سے اچھی بات کہہ سکتا تھا۔"

اور اب گفتگو کے اختتام پر اختر صاحب کا ایک پسندیدہ شعر سن لیجیے ؎

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا (غالب)

اور میرا خیال ہے اپنی گفتگو سے اختر صاحب نے پڑھنے والوں کے ذہن میں ضرور گہرے نقش چھوڑے ہوں گے اور جنھیں آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔

وقار حسین

حضرت اختر سعید خاں اختر

سرزمین بھوپال کو شہرِ غزل بھی کہا گیا ہے اور علم و ادب کا گہوارہ بھی۔ بھوپال عالموں، شاعروں، ادیبوں کی سرزمین ہے اور وہاں اک گھر ایسا بھی ہے جس کی فضا میں شعر و ادب کی خوشبو ہے اور جسے علم و ادب کا ادارہ کہا جاتا ہے وہ گھر ہے جناب حامد سعید خاں صاحب مرحوم کا۔

جو خود بھی ایک قادر الکلام اور بلند مرتبہ شاعر تھے جن کی آواز اپنے عہد کی ایک معتبر آواز تھی۔ حامد صاحب کے بارے میں مشہور نقاد نیاز فتح پوری نے کہا تھا۔ حامد کی شاعری صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے کلاسیکی چیز ہے اور اس میں وہ سب کچھ ہے جسے قدما اور متاخرین کے تغزل کا سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔

اسی گھر میں ۲؍اکتوبر ۱۹۲۳ء کو اختر سعید خاں اختر پیدا ہوئے۔

اف یہ زمین مسکنِ آدم
رک نہ سکے فردوس میں بھی ہم

مسکنِ آدم میں جن پہلی آوازوں نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا وہ ان شاعروں کی تھی جو ہندستان بھر سے اس گھر میں تشریف لاتے رہتے تھے۔

اختر صاحب کے مجموعہ کلام "نگاہ" کے دیباچہ میں سردار جعفری صاحب لکھتے ہیں۔

"اختر سعید خاں کی شاعرانہ تہذیب کی تربیت میں سارے ہندستان کے شاعروں کا حصہ ہے جو ان کے والد محترم حامد سعید خاں صاحب کے گھر مہمان ہوتے تھے اور اختر کی روح شعروں کے پھولوں سے بھر جاتی تھی۔"

شعر و ادب کی وراثت اختر سعید خاں نے اپنے والد محترم سے پائی جس کا اعتراف انھوں نے یوں کیا ہے "میرے شعر کی تہذیب میں میرے والد مرحوم جناب حامد سعید خاں صاحب حامد کے شعری معیار اور میرے بھائی اظہر سعید خاں کے نکھرے ذوق کو بڑا دخل ہے۔"

لیکن میری رائے میں اختر صاحب کے شعری سفر میں ان شہروں نے بڑی مدد

کی ہے جہاں وہ دوران تعلیم قیام کرتے رہے۔ دہلی۔ لاہور اور علی گڑھ وہ شہر ہیں جو علم و ادب کا مرکز رہے ہیں اور یہیں ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۶ تک ایک طرف انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی تو دوسری طرف اپنے عہد کے مشاہیر ادیبوں، شاعروں اور نامور اساتذہ کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا۔

ایل ایل بی کرنے کے بعد اختر صاحب نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اگرچہ وکالت کا پیشہ ان کے شاعرانہ مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا لیکن اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت کی وجہ سے ان کا شمار ممتاز ترین وکلا میں ہوتا ہے۔

زندگی کی قدروں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تہذیب، معاشرت، زبان و ادب میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ٹینی سن نے درست کہا ہے "پرانا نظام بدل جاتا ہے اور اپنی جگہ نئے نظام کے حوالے کر دیتا ہے"۔ اختر سعید خاں نے جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پائی لیکن انھوں نے کبھی بھی نئے نظام کی قدروں سے چشم پوشی نہیں کی۔ جیسے جیسے ان کے شعور میں پختگی آتی گئی ان کی غزلوں میں سماجی رشتوں کا احساس بڑھتا گیا۔ زندگی اور زندگی کے معاملات کا گہرا شعور اور آگہی ہی ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی کا سبب بنی۔ ان پر رومین رولاں کا یہ قول صادق آتا ہے "جہاں کہیں فضاؤں میں امید ہے وہ اس کی آواز سن لیتا ہے۔ جہاں دکھ ہے وہ محسوس کر لیتا ہے" اختر صاحب کی شاعری کی اساس ان ہی دو باتوں پر ہے امید اور دکھ کا احساس۔ اسی امید نے انھیں ترقی پسند بنایا لیکن ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود ان کی غزلوں میں حسن و رعنائی اور دلکشی کی وہ کیفیات باقی رہیں جنھیں تغزل کی جان سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی رائے میں "اختر سعید خاں کے کلام میں ترقی پسندی کے باوجود غیر معتدل ترقی پسندانہ عناصر نظر نہیں آتے۔ ان کے یہاں غزل غزل ہی رہی پروپیگنڈا نہیں بنی۔ حسن و محبت کے مضامین و کیفیات کو جس فطری حسن کے ساتھ ادا کرتے ہیں اسی طرح سماجی معاشی اور سیاسی محرکات کو بھی"۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہمیشہ ایک نئے جذبہ کے ساتھ زندگی کو سنوارنے اور حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ ان کا رویہ ہمیشہ رجائی رہا۔ ان کی غزلوں میں قنوطیت نے کبھی جگہ نہیں پائی اور ان کے شعری رویہ میں مقصدیت اور اجتماعی شعور کی قوتیں ایک نئے آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہیں ؎

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات اُن کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی

ہم صفیرانِ چمن مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہوگی

ہر خواب اعتبار شکستوں سے چور ہے دل میں مگر غرور تمنا عجیب ہے

اختر یہ تیرے پاؤں کے کانٹے نئے نہیں
کانٹوں سے کھیلتا ہوا چھالا عجیب ہے

یہ زمانہ مجھے جب زخم نیا دیتا ہے
ایک چراغ اور بھی سینہ میں جلا دیتا ہے

سنور جائے گی جب ہاتھوں سے اپنے
یہ دنیا پھر نظر آئے گی دنیا
طلوعِ فکر انسانی کی باتیں
کوئی دن اور جھٹلائیگی دنیا

بلائے تیرہ شبی کا جواب لے آئے
بجھے چراغ تو ہم آفتاب لے آئے

یہ دکھ کا احساس ہی ہے جو اختر صاحب کو میر سے بہت قریب کیے ہوئے ہے لیکن عشقیہ معاملات، واردات وکیفیات کے اظہار کے باوجود ان کی غزلیں قدیم رنگ کی غزلوں سے مختلف ہیں اور ان غزلوں کو اک نئے رنگ سے سجایا گیا ہے۔

اختر صاحب نے روایت سے کبھی انحراف نہیں کیا، وہ روایت کے طرفدار ہی نہیں بلکہ پاسدار بھی ہیں لیکن پاسداری کے باوجود ہر غزل ایک نئے انداز اور زاویے سے کہی گئی ہے۔ جو خیال کی لطافت اور حسن ومعنی سے آراستہ ہے۔ ساحل احمد ان کے بارے میں رقم طراز ہیں، "اختر صاحب کی غزلیں میریت کا انداز لیے ہوئے ہیں جن میں کرب واحساس کی روئیں الفاظ کی تہوں سے اٹھ کر حزنیہ لے کی تخلیق کرتی ہیں جن کی پُرسوز کیفیت میں زندگی کی سچائیوں اور تجرباتی حقائق کے سماعی خطاب کا حسن موجود ہے۔"

بے نوا ہوگا نہ اس شہر میں ہم سا کوئی
زندگی تجھ سے مگر ہم کو گلا بھی کیا ہے
زندگی چھین لے بخشی ہوئی دولت اپنی
تو نے خوابوں کے سوا مجھ کو دیا بھی کیا ہے

آخر کار زندگی خاک اڑا کر رہ گئی
دامن ماہ وسال میں گرد ملال بھی نہیں

کیا کھیل تھا دل کا توڑ دینا اب میری طرح سے تو بھی چپ ہے

اختر سعید خاں

کوئی مجھ سے جُدا ہوا ہے ابھی
زندگی اک سانحہ ہے ابھی

بچھڑنا اک قیامت ہوگیا ہے
بہت نزدیک آنا بھی بُرا ہے

کس کے ہاتھوں بک جائے کن داموں معلوم نہیں
دل کی قیمت دونوں عالم دل کی قیمت ایک نظر

اے دشت جنوں گواہ رہنا
کانٹے ہیں اور اک برہنہ پا ہے

پھرتی ہے زندگی جنازہ بدوش
بُت بھی چُپ ہیں، خدا بھی ہے خاموش

یہاں زمیں بھی قدموں کے ساتھ چلتی ہے
یہ عالمِ گزراں ہے ذرا سنبھل کے چلو

میں نے مانا اک نہ اک دن لوٹ کے تو آجائیگا
لیکن تجھ بن عمر جو گزری کون اُسے لوٹائیگا
کتنی یادیں کتنے قصے نقش ہیں ان دیواروں پر
چلتے چلتے دیکھ لیں مڑ کر کون یہاں پھر آئیگا

اختر سعید خاں صاحب کے خوب صورت مجموعہ کلام "نگاہ" کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ وہ ان ممتاز شعرا میں سے ہیں جنھوں نے شعر کو بطور فن نہیں اپنایا بلکہ ع

"شعر خود خواہش آں کرد گردد فن ما"

ان کی غزلوں میں گہرے سماجی شعور انسانی اقدار کا شدید احساس اور جمالیاتی پہلوؤں کا سچا ادراک اس قدر نمایاں ہے جو انھیں اپنے عہد کے ممتاز شعرا کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ان کے شاعرانہ فن کو روایت طبیعت اور ذہانت نے مل کر ایک ایسا طرز اسلوب عطا کیا ہے جسے لب ولہجہ کی سلاست فکرو نظر کی اصابت اور انتخاب الفاظ کی اصالت نے ایک انفرادی شان عطا

کر دی ہے۔

کون سر پھوڑ کے مرتا ہے کسی کے در پر
ختم ہو جائیگی تہذیبِ وفا میرے بعد

میں دستِ بے ہنر میں ایک پتھر ہوں ہنر والو
مجھے پھر سے تراشو اور تابِ زندگی دیدو

یہ شمعِ رہگذر ہے اس کو جلنے دو ہواؤں میں
تہِ دامن نہیں رکھتے چراغِ فکر و فن اختر

ہر چند کہ پرستش کی ادا اور ہی کچھ ہے
گلِ رنگیِ دامن کی حیا اور ہی کچھ ہے

مجھے ہر بات پہ جھٹلا رہی ہے
یہ تجھ بن زندگی کو ہو گیا کیا

ختم ہوتا ہے کہیں سلسلہ کارِ جنوں
خاکِ ساحل نہ سہی موج دریا ہی سہی

خموش رہیے تو کیا کیا صدائیں آتی ہیں
پکاریے تو کوئی مُڑ کے دیکھتا بھی نہیں
کسی کے تم ہو کسی کا خدا ہے دنیا میں
مرے نصیب میں تم بھی نہیں خدا بھی نہیں

عشق کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کا ماتم کیا کریں
زندگی آ تجھ سے پھر اک بار سمجھوتہ کریں
مُڑ کے دیکھا اور پتھر کے ہوئے اس شہر میں
خود صدا بن جاؤ آوازیں اگر پیچھا کریں

نہ کھلا کس کی ہے جاگیر ہنسی کی دولت
مسئلہ دیدۂ گریاں نے اٹھایا بھی تھا

دھوپ ہی دھوپ نہ تھی دشتِ جنوں میں پہلے
کچھ گھنے پیڑ بھی تھے راہ میں سایا بھی تھا

یوں تو ان کی غزلوں میں بے شمار ایسے موضوع ملتے ہیں جو زندگی کی صحت مند قدروں کے ترجمان ہیں لیکن انھوں نے جس موضوع کو بھی اپنایا اس میں جہاں اک خاص قسم کی متانت اور شائستگی کو برقرار رکھا ہے وہیں حسن و رعنائی کی سحر خیز فضا بھی پیدا کر دی ہے۔

زمانہ ہو گیا اس راہ سے گزرے ہوئے تجھ کو
مجھے گھیرے ہوئے ہیں آج تک پرچھائیاں تیری

قیمتِ دل کا مجھے اندازہ کچھ ہو تو سہی
پھر چرا لینا نگاہیں پہلے دیکھو تو سہی

کچھ نظر آتا تو ہے وہم و یقیں کے درمیان
یہ مرا سایہ ہے یا میں ہوں بتاؤ تو سہی

اک رسم تھی زندگی سو ہو لی
نازاں ہیں نہ شرمسار ہیں ہم

اختر صاحب نے اپنے تصورِ حیات کو جس فنکارانہ انداز میں خونِ دل میں ڈبو کر اشعار کا قالب عطا کیا ہے وہ صرف ان ہی کا حصہ ہے ان کے کمالاتِ شعری کا اس مختصر مضمون میں احاطہ کرنا ممکن نہیں کیوں کہ ان کی غزلیں بہت سی کیفیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

پسِ بہار نظارہ مرا لہو تو رہے
بلا سے میں نہ رہوں گل کی آبرو تو رہے

جلائے خونِ جگر سے مشعل چلے ہیں ہم روشنی لٹاتے
ہوا کے جھونکوں میں جھلملاتے چراغ کیا راستہ دکھاتے

زندگی مشغلۂ خونِ تمنا ہی سہی
ہم سے اک لمحہ زمانہ میں اجالا ہی سہی

آج بھی دشتِ بلا میں نہر پر پہرہ رہا   کتنی صدیوں بعد میں آیا مگر پیاسا رہا

اندھیرا جو عیاں صبح کی تنویر میں ہے
کچھ کمی خون جگر کی ابھی تصویر میں ہے

دشتِ جنوں سے لوٹ کے آنا کار اہل عشق نہیں
پہلے سفینہ اپنا جلایا جب ہم اُترے ساحل پر

قطرہ قطرہ جو پی گیا ہے
دریا دریا پکارتا ہے

اختر سعید خاں کو زندگی سے والہانہ محبت ہے اور محبت ان کے یہاں زندگی کا ایک حصہ ہے۔ ان غزلوں میں جن کا تعلق مضامین حسن وعشق سے ہے رمزیت اور ایمائیت کی کیفیت بڑے لطیف پیرایے میں ملتی ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ ایمائیت میں کہیں ابہام نہیں ہونے پاتا۔وہ عشق سے زیادہ غم عشق کے شاعر ہیں۔ غم عشق ہو یا غم زندگی دونوں کو وہ تہذیبی سرمایہ سمجھتے ہیں ان کی ذات اور شخصیت بڑی پہلو دار اور حسین ہے اور ان کی شخصیت کا سارا حسن ان کی شاعری میں جھلکتا ہے۔

رنگ گل رنگ بُتاں رنگ جبیں محنت
جو حسیں رنگ ہے شامل مری تصویر میں ہے

ملکہ نسیم

اختر سعید خاں ـــ غزل کے آئینے میں

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ عصرِ حاضر کے شعری ادب کو بھوپال نے کیا دیا تو میں بلا تامل کہوں گی کہ اختر سعید خاں کی غزل۔

غزل جو ہماری شعری جمالیات کا مرقع بھی ہے اور تہذیبی زندگی کا صحیفہ بھی۔ اختر صاحب کی غزل تربیت یافتہ اذہان کو متاثر کرنے والی چیز ہے۔ ان کی غزل کے خلوت کدے میں باریابی کے لیے نگاہ کی بھی ضرورت ہے اور دل کی بھی۔ ذرا نزدیک سے دیکھیے تو خود اختر صاحب کی شخصیت غزل کی تہذیب کے ہاتھوں سنواری ہوئی نظر آتی ہے۔ وہی درد وداغ، وہی سوز و ساز، وہی آرزو، وہی جستجو جو غزل کا سرمایۂ تہذیب ہے، اختر صاحب کا سرمایۂ جاں ہے۔ شفیقہ آپا (پروفیسر شفیقہ فرحت) کے پوچھنے پر کہ آپ نے غزل کو کیوں اختیار کیا؟ اختر صاحب نے بے اختیار فرمایا تھا کہ "صاحب خود غزل نے مجھے اختیار کر لیا"۔ اختر صاحب کی غزل کلاسیکی طرزِ ادا کا اقرار بھی ہے اور انحراف کے حسنِ یقین کا اظہار بھی۔ ان کی غزل اپنے عہد کے تفکر کی پاسدار ہے لیکن اسے کسی عہد تک محدود کر دینا سخت ناانصافی ہوگی۔ ان کے شعر کی مجموعی تاثیر آپ بیتی اور جگ بیتی میں کوئی حدِّ فاصل قائم نہیں کرتی۔ دنیا کو بدلنے کی بات ہو یا ہجر کی اُفتاد، وہ دونوں کو پہلے شعری جمالیات کے سانچے میں ڈھالتے ہیں پھر ہمیں اس تحیر، تجسس، درد، اور آرزومندی سے آشنا کرتے ہیں جو ان کے احساس اور فکر کا حصہ ہے۔

اختر صاحب اس کے قائل ہیں کہ جمالیات انسانی زندگی کو ایک نوع کی آسودگی عطا کرتی ہے اور ہر وہ شے جو زندگی کو آسودگی عطا کرتی ہے اس کی خواہش دنیا کو بدل دینے کی وسیع تر آرزو میں شامل ہے۔ اس لیے دردِ ہجر، دردِ حیات سے الگ شے نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے نقطۂ نگاہ کو بڑے لطیف انداز سے ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

غمِ جہاں میں غمِ دل شمار ہو کے رہا
یہ فیصلہ بھی سرِ کوئے یار ہو کے رہا

اس شعر کی خوبی محض اس میں نہیں ہے کہ آخر کار غمِ دل غمِ جہاں میں شمار کر لیا

گیا۔ حسن اس میں ہے کہ یہ فیصلہ کوئے یار میں ہوا۔ اس بلاغت کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ لیکن میں جو عرض کرنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ اختر صاحب کا یہ مطلع ان کے شعری رویہ کی کلید ہے۔ اختر صاحب کی غزل اپنے عہد کی سب سے ترقی یافتہ شعور کی ہمسفر نظر آتی ہے۔ یہاں ذرا ٹھہر کر دیکھتے چلیں کہ اس شعری سفر میں اختر صاحب کن راہوں سے گزر چکے ہیں۔

آزادی سے پہلے ریاست بھوپال کو تہذیبی، ثقافتی، علمی اور ادبی اعتبار سے ہندستان میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ شہر بھوپال نے شروع ہی سے ملک کے دوسرے علمی اور ادبی مراکز سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے اور بلند پایہ عالموں، دانشوروں شاعروں اور ادیبوں کے لیے اپنے در کشادہ رکھے ہیں۔ جو سورج یہاں جلوہ فگن ہوئے ان کی چمک آج بھی اس زمین کے ذرّوں میں نظر آتی ہے۔ ایک وقت تھا جب قدیم بھوپال کے شاہی محلّات علمی اور ادبی قدر دانیوں کے لیے مشہور تھے اور ماضی کے اس چھوٹے سے شہر میں نہ جانے کتنے گھر علمی اور ادبی مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایسے ہی ایک تہذیبی روایت کے مسکن اور شعر و ادب کی آوازوں سے گونجتے ہوئے گھر میں اب سے ۶۹ سال پہلے جناب اختر سعید خاں صاحب نے آنکھ کھولی۔ ان کے والد گرامی حضرت حامد سعید خاں صاحب حامدؔ مرحوم ایک بلند پایہ صاحب طرز شاعر تھے جنھوں نے ستّر بہتّر سال پہلے امیرؔ اور داغؔ کے تلامذہ کی روایت سے ہٹ کر بھوپال کی غزل کو اپنے عہد کے جدید رنگ تغزّل کا اداشناس بنا دیا تھا۔ ایک طرف وہ بھوپال کے جاگیرداروں میں سے تھے اور والی ریاست اور نواب زادگان سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ دوسری طرف ملک کے مشہور اور معروف شعرا، ادبا ان کے بہت ہی عزیز دوست تھے۔ جن میں اکثر و بیشتر تہیوں ان کے ذاتی مہمان ہوتے تھے اور شعر و ادب کی محفلوں سے ان کے گھر کو ایک ادارہ کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔

حامد سعید خاں صاحب کو یوں تو تمام اصناف سخن پر عبور حاصل تھا لیکن بقول جگر مرادآبادی "غزل ان کی محبوبۂ دل نشیں تھی"۔ اگلے وقتوں کے لوگ کہتے ہیں کہ اس دور میں بھوپال میں جیسا اور جتنا غزل گوئی کا ذوق تھا ایسا پھر دیکھنے میں نہیں آیا۔

اس سخن فہمی اور سخن گوئی سے معمور ماحول اور غزل کی سریلی آواز سے گونجتی ہوئی فضا میں اختر صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی اظہر سعید خاں کا غزل سے اثر قبول کرنا قدرتی بات تھی۔ سخن گوئی کی اوّلین مشقِ ناز غزل پر ہی کی جاتی رہی ہے۔ اس لیے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دیوار دبستاں پر اختر سعید خاں نے غزل ہی کا کوئی شعر لکھا ہوگا اور یہ ذوقِ شعر عمر، شعور اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ پروان چڑھتا رہا ہوگا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد اختر سعید خاں نے دہلی، لاہور اور علی گڑھ میں اعلا تعلیم

مدارج طے کیے۔ تینوں شہر اس دور میں شعر و ادب کا گہوارہ تھے۔ اردو کی بیشتر قد آور ہستیاں یہیں قیام پذیر تھیں۔ انھوں نے سب کو دیکھا، سب کو سنا اور سب سے استفادہ کیا۔ ۱۹۴۶ء میں علی گڑھ سے ایل ایل بی کی ڈگری لے کر بھوپال لوٹے۔ اختر صاحب کو اعتراف ہے کہ اس دور میں حصول تعلیم کے علاوہ انھیں دہلی میں اپنی زبان کی اصلاح کا موقع ملا۔ لاہور میں ادبی جدت طرازیوں سے تعارف ہوا اور علی گڑھ میں فکر و نظر کی منزلیں طے کرنے کا سازگار ماحول ملا۔ بھوپال آکر، ۱۹۴۷ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم ممبر ہو گئے۔ انجمن کے غیر قانونی قرار پانے کے بعد سال بھر انڈر گراؤنڈ رہے۔ انجمن کا شیرازہ بکھر جانے کے باوجود تا حال اس سے وابستہ ہیں ان کے نزدیک ترقی پسندی ایک ذہنی رویّہ ہے اور انھیں اس پر اصرار ہے۔ ان کا خیال ہے "تخلیق ادب کے لیے تحریک اتنی اہم نہیں جتنا اہم ذہنی رویّہ ہے" اختر صاحب نے پختہ اور سنجیدہ شعور کی سطح پر پہنچ کر ترقی پسند ادب کی تحریک کی وابستگی اختیار کی جو اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے محض جذباتی طور پر نہیں بلکہ نظریاتی اعتماد و یقین کے ساتھ ترقی پسند نقطۂ نظر کو قبول کیا تھا ان کا شعر ہے ؎

کسی اور وضع کے پیرہن سے سجاؤ قامتِ عشق کو
جو ملے تھے ہم کو وراثتاً وہ لباس ہم نے جلا دیے

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند ادب اپنے عہد کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ شعور کا عکاس ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ادب کو کسی سیاسی مشن کا تابع نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ادب میں سیاسی تصورات کی ترجمانی نہ ممنوع ہے نہ قابلِ گرفت۔ سیاسی تصورات ہماری شاعری میں ہر عہد میں دخیل رہے ہیں۔ کبھی آزادی کی آرزو کی شکل میں کبھی اہل فرنگ کی ترکتازی کے خلاف، کبھی طبقاتی کشمکش کی صورت میں اور کبھی محنت اور سرمایے کے ٹکراؤ کی صدائے بازگشت بن کر۔ شاعری میں جذبہ ہو یا خیال اس کی پہلی شرط جمالیاتی قدروں کی پاسداری ہے۔ مارکس کا فلسفہ ہو کہ رومی کا تصوف، شعری جمالیات سے اگر محروم ہے تو اعلا شاعری میں اس کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ماضی میں سیاسی تصورات کو عام طور پر شاعرانہ محاسن سے آراستہ کر کے غزل میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس لیے مثالوں میں پیش کیے جانے کے باوصف وہ قدرِ اوّل کی چیز نہیں بن سکے۔ ترقی پسند ادب کے ابتدائی ہیجانی دور کو چھوڑ کر شاعری جب اپنے محاسن کی آراستگی کے ساتھ شروع ہوئی تو وہ اپنے عصر کی ترجمانی بھی تھی اور جمالیات کا مرقع بھی۔

ترقی پسندی کے ابتدائی دور میں سیاسی اور سماجی بے چینی اور انتشار کے سبب نئے ذہنوں کو مستقبل کے لیے ایک واضح راستہ کی تلاش تھی اور خود اپنی شناخت کے مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ سماج کو تبدیل کرنے کے لیے

اجتماعی عمل یعنی "انقلاب"، کی جہتیں مارکسی نظریے کے تحت ضرور واضح اور متعین ہو چکی تھیں اور اس نظریے کے زیر سایہ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تھا لیکن یہ "انقلاب"، جس کا حسین خواب اس تحریک نے ذہنوں کو بخشا تھا شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

یہی وہ موڑ ہے جہاں اختر صاحب کی غزل عصری تقاضوں کو سمیٹے، کلاسیکی شیوہ بیانی کو اپنائے روشنی بکھیرتی اپنا سفر طے کرتی نظر آتی ہے ؎

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی

ہم صفیرانِ چمن مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہوگی

چمن میں دھوم تھی صبحِ بہار کی لیکن
کھلے نہ پھول صبا کی خجستہ پائی سے

کل اس زمیں پہ اتریں گے پھولوں کے قافلے
اک پیکرِ بہار کی آواز پا ہیں ہم!

لیکن ایسا نہیں ہے کہ ترقی پسند شعرا مستقبل سے مایوس ہو گئے تھے۔ وہ نہ انسان سے مایوس تھے نہ مستقبل سے۔ اختر صاحب کے یہ شعر دیکھیے۔

ہر خوابِ اعتبار شکستوں سے چور ہے
دل میں مگر غرورِ تمنا عجیب ہے
سارا بدن ہے دھوپ میں جھلسا ہوا مگر
دل پر جو پڑ رہا ہے وہ سایہ عجیب ہے

جو زخم دے کے گئی ہے ابھی نسیمِ سحر
سکوتِ گل سے عیاں ہے ذرا سنبھل کے چلو
سلگتے خوابوں کی بستی ہے رہ گذارِ حیات
یہاں دھواں ہی دھواں ہے ذرا سنبھل کے چلو

سحر ہوئی تو ماحصل یہ تھا شبِ امید کا
جو اعتبار تھا گیا جو انتظار تھا رہا

محوِ خواب دُنیا کی بیکراں خموشی میں
جو ٹہک اٹھے گل ہے جو دھڑک اُٹھے دل ہے

ان اشعار میں سے ہر شعر ایک دفتر چاہتا ہے کہ شرح و بسط سے ان نفسیاتی محرّکات کا تجزیہ کیا جائے جو ہمارے شاعر خوش نوا کی ان شعری تخلیقات کے پس پردہ کارفرما رہے ہیں اور جو اپنے منفرد لب و لہجے کے ساتھ ایک انقلاب افروز خوش آیند مستقبل کے لیے جدّ و جہد، عمل پیہم، یقین اور اعتماد کی مشعلوں کو روشن کر رہا ہے۔

اختر سعید خاں بھی خوش آیند مستقبل کی انفرادی اور اجتماعی جہد و عمل اور فکری و ذہنی انقلاب کی نہ صرف حمایت کرتے ہیں بلکہ اپنے ان ہم نواؤں کے دلوں کے بند دریچے بھی کھولتے ہیں جو افسردگی اور خوابیدہ احساس کے شکار ہو چکے ہیں ؎

بند رکھو گے دریچے دل کے یارو کب تلک
کوئی دستک دے رہا ہے اٹھ کے دیکھو تو سہی

توڑ کے پاؤں نہ بیٹھو اختر جاری رکھو اپنا سفر
اس سے اگلے موڑ پہ شاید آن ملے وہ کس کو خبر

نہ اٹھی میری نواؤں سے قیامت نہ سہی
ایک آہٹ تو ہوئی ایک دریچہ تو کھلا

اختر صاحب نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد انھوں نے اچھی نظمیں بھی کہیں جن کے مطالعے سے اختر سعید خاں کے سیاسی شعور، وطن کی محبت، انسان دوستی، حق پرستی اور مظلوموں کے لیے ان کے ہمدردانہ جذبات کا پتا چلتا ہے۔ لیکن اختر صاحب کا اصل FORTE (فوقیت) ان کی غزل سے عبارت ہے جس میں وہ اپنی تمام دِلی کیفیات، ذہنی اور فکری تصوّرات اور احساسات کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ کسی بھی فعال اجتماعی تحریک یا انفرادی عمل کے لیے خود اعتمادی کا جوہر بہت اہم اور ضروری ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اس خود اعتمادی کی کمی اکثر و بیشتر اجتماعی تحریکات یا انفرادی جدّ و جہد کی ناکامی کا سبب بن جاتی ہے۔ جس طرح تحریک قائد کی خود اعتمادی اور قوتِ ارادی سے کامیاب ہوسکتی ہے اسی طرح اختر صاحب کے ہاں خود اعتمادی اور قوتِ ارادی کے بہت تابناک منظر نظر آتے ہیں مثلاً

کہو آندھیوں سے آئیں کہو برق سے جلائے
یہ رہا میرا نشیمن کوئی آنکھ تو اٹھائے

بلائے تیرہ شبی کا جواب لے آئے
بجھے چراغ تو ہم آفتاب لے آئے
ہم اس زمین پہ میزانِ عدل رکھتے ہیں
کہو زمانے سے فردِ حساب لے آئے

صفحۂ ہستی پہ اب تک نقش ہیں سب نا تمام
چشمِ خوں بستہ رکھو، دل کو لہو کرتے رہو

اقبالؔ نے بطنِ گیتی سے آفتاب تازہ پیدا ہونے کی بشارت دی تھی اور ڈوبے ہوئے تاروں کے ماتم کے بجائے "آہِ شرر فشاں" اور "نفس شعلہ بار" سے اپنے درماندہ کارواں کو ظلمتِ شب سے نکال کر وادیِ گل میں لے جانے کا حوصلہ دیا تھا۔ زوال پذیر سرمایہ دارانہ نظامِ حیات کو جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کہا تھا اور یہ بھی کہ تدبّر کی فسوں کاری سرمایہ دارانہ متمدّن کو استحکام نہیں بخش سکتی۔ اس عقیدے کا اظہار جا بجا ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔ شعر و ادب کی تعمیر اور ارتقا میں اقبال کا اندازِ فکر، فلسفۂ حیات و فن اور مستقبل کے لیے حقیقت پرور اور بصیرت افروز نگاہ نے زبردست کردار ادا کیا ہے۔ ترقی پسند ادب کا کوئی بھی قابلِ ذکر فنکار ایسا نہیں جو اقبالؔ سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اخترؔ صاحب بھی فکر اقبالؔ سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ شیدائی ہیں۔ ان کے اکثر اشعار سے اقبال سے اثر قبول کرنے کے گہرے نقوش ملتے ہیں ؎

شعاعِ مہر اُلٹنے کو ہے بساطِ فلک
ستارے رات کی محفل سجائیں گے کب تک

طلوعِ فکرِ انسانی کی باتیں
کوئی دن اور جھٹلائیگی دنیا

جو میں خود ٹھہر نہ جاؤں سرِ منزلِ تمنّا
میری گرد بھی نہ پائے یہ تھکا ہوا زمانہ

ادھر سے بھی گزر جائے بہارِ زندگی اک دن　　دیارِ ہند میں آباد ویرانے ہزاروں ہیں

ان گنت صدیوں سے ہوں آوارۂ دشتِ حیات
اس خرابے سے مگر رشتہ نیا ہے آج بھی

گدائے بے سروپا ہوں مگر یہ قصرِ وجود
لرز رہا ہے میری سطوتِ گدائی سے

انجم و خورشید و ماہ جس کو نہ ٹھہرا سکے
وہ نگہِ بے قرار اہل نظر کیا ہوئی

اختر سعید خاں کو تہذیبی وقار، نفاستِ مزاج، وضع داری، اخلاق کی بلندی گہری بصیرت اور دیدہ وری جیسی نعمتیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملی ہیں۔ اس ہشت پہل شخصیت کی قوسِ قزح ان کے اشعار ہی میں نہیں ان کی گفتار میں بھی کھلتی ہے۔ اختر صاحب کی غزل میں زندگی اور اس کی شیوہ طرازیاں اتنے مختلف پیرایوں کے ساتھ اور اتنی کثرت سے نظر آتی ہیں کہ اس مختصر مضمون میں ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ زندگی کے ساتھ ان کا سلوک بڑا عاشقانہ ہے۔ وہ زندگی سے خوش بھی ہیں اور ناخوش بھی۔ وہ اس کے ساتھ ہنستے ہیں، آنسو بہاتے ہیں۔ کبھی روٹھ جاتے ہیں، کبھی مناتے ہیں، کبھی اس سے فلسفیانہ گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی بھولی بھالی باتیں کرتے ہیں۔ کبھی اس کے دیے ہوئے زخم ہنسی خوشی قبول کر لیتے ہیں تو کبھی اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو لوٹانے لگتے ہیں۔ زندگی سمٹ کر کبھی ان کا دل بن جاتی ہے اور کبھی وہ اس کی وسعتوں میں کھو جاتے ہیں۔ اگر ہم زندگی کے تعلق سے ان کے کہے ہوئے اشعار یکجا کریں تو ماضی کی ایک دنیا ہمارے دامن میں سمٹ آئے گی۔ لطف یہ ہے کہ زندگی کے تعلق سے بات فکر و نظر کی ہو یا حسن و عشق کی شعری جمالیات کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ چند شعر دیکھیے ؎

کتنی تعبیروں کو آنکھوں میں بسا رکھا ہے
زندگی تیرا ہر اک خواب ادھورا ہی سہی

وہم و خیال کی طرح کٹتے ہیں زندگی کے دن
قہر یہ ہے کہ زندگی وہم و خیال بھی نہیں

آخر کار زندگی خاک اڑا کے رہ گئی
دامن ماہ و سال میں گردِ ملال بھی نہیں

مجھے ہر بات پر جھٹلا رہی ہے
یہ تجھ بن زندگی کو ہو گیا کیا

وہ ایک لمحہ جو میری گرفت میں نہ آسکا
لیے حیاتِ جاوداں قریب سے گزر گیا

زندگی چھین لے بخشی ہوئی دولت اپنی
تو نے خوابوں کے سوا مجھ کو دیا بھی کیا ہے
بے نوا ہو گا نہ اس شہر میں ہم سا کوئی
زندگی تجھ سے مگر ہم کو گِلا بھی کیا ہے

پھر رہا ہوں کو بہ کو، زنجیرِ رسوائی لیے
ہے تماشا سا تماشا زندگی کے نام پر

عشق کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کا ماتم کیا کریں
زندگی آ تجھ سے پھر اک بار سمجھوتہ کریں

کوئی صبح رخصتِ دید کی کوئی شام مہلتِ درد کی
یہی صبح و شام گرہ میں تھے یہی زندگی نے گنوا دیے

اب اور نذر کو کیا لے کے زندگی آئے
کفیلِ صبح اگر خونِ کربلا بھی نہیں

زندگی کے رمز و معنی کو غزل کے پیرہن سے آراستہ کرنے کا سلیقہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ جب تک ایک دردمند دل اور غالب کے الفاظ میں "دل گداختہ" پیدا نہ ہو، "حسنِ فروغِ شمعِ سخن" دور ہی رہے گا۔ غزل جس دردمندی کی وجدان آمیز حیثیت کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ ایک دل گداختہ کے سینے میں دھڑکنے کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اختر سعید خاں طبعاً ایک ایسا ہی دردمند دل لے کر آئے ہیں۔ ان کی تمام تر شخصیت اس دردمندی سے سرشار ہے۔ مزاج کی نفاست، تہذیب و شائستگی کی دلبرانہ لطافت، وضع داری اور حفظِ مراتب کی اعلا قدروں کی پاسداری جیسے اوصاف سے بیک وقت متصف شخصیت اس ناشناسی کے رستاخیز میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے ان طبعی خصوصیات

سے جس شخصیت کا خمیر اٹھا ہو، اس کے سینے میں ایک دلِ درد مند اور دل گداختہ نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟ محبت اور خلوص و وفا اس کا شیوہ نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟ ''دل بدست آوردن'' اس کا شعار نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟ اختر سعید خاں کے کلام کا معتد بہ حصہ محبت سے عبارت ہے کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں کے آبگینے تندیٔ صہبائے محبت سے پگھل کر روحِ احساس میں اترے جارہے ہیں۔ یہی درد آشنا، محبت شعار دل کا کاشانہ ہے۔ جس پر بقول اقبال کبھی عرش تو کبھی کعبہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ جس کی ایک لغزشِ مستانہ رشک صد سجدہ ہے اور جس کی خاک اکسیر بن جاتی ہے، یہی منزل بھی ہے۔ یہی جرسِ کارواں بھی۔ ''حدیث دل'' کا بیان ترقی پسند رویے کے زیر اثر نئے رمز و کنایہ نئے استعارہ و علامت اور نئی جہات سے آشنا ہوا۔

اردو شاعری میں غزل اس ''محبت'' کی امین قرار پائی ہے جسے قلب کائنات کی دھڑکن سے تعبیر کیا جائے تو بجا ہوگا بقول اختر سعید خاں ؎

کسی کے پاؤں کی آہٹ کے انتظار میں ہے
دھڑک رہا ہے دل کائنات کہتے ہیں

.. یہی محبت بقول اقبال اگر ایک طرف ''شراب روح پرور'' اور ''شمع انجمن'' ہے تو دوسری طرف ''شمشیر فاتح عالم بھی''۔ میر سے لے کر عہد حاضر کے تقریباً تمام غزل گو شعرا کے یہاں نئے نئے اشعار سے محبت اور جمالیات کے موضوعات کو اپنی غزل میں برتنا جارہا ہے۔ حالی سے لے کر موجودہ دور کے بعض انتہا پسند نقادوں نے ہزار قدغن غزل کے مرکزی رویے پر لگائے لیکن حسن و عشق کی کیفیات اور احساس جمالیات کی طلسماتی فضا سے غزل کو محروم نہ کر سکے۔ ایک اعتراض کے جواب میں فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ جمالیاتی قدر بھی ایک سماجی قدر ہے تو آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کی افزائش بجائے خود سماجی زندگی کی آسودگی اور بہتری میں اضافہ کرتی ہے'' یا دوسرے الفاظ میں حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل نہیں افادی فعل بھی ہے۔''[1]

بہت طویل سفر تھا یہ طے ہوا کیسے
ترے بغیر یہاں تک میں آگیا کیسے

وہ ماہ تھا نہ ہوائے بہار کا جھونکا
نہ جانے پھر مجھے دیوانہ کر گیا کیسے

ان سے چھٹ کر دلِ بے تاب کا عالم مت پوچھ
کوئی آتا ہو، سمجھتا ہے کہ وہ آئے ہیں

---

[1] ''شاعری کی قدریں'' فیض احمد فیض

سارے قصے مہر و وفا کے دل سے محو ہوئے لیکن
جب بھی کوئی کسی سے بچھڑا یاد آیا اک نام بہت

اک فسانہ بنا گئیں ہم کو
چھوٹی چھوٹی کہانیاں دل کی

اب جو ہم اس موڑ پر بچھڑے تو جائیں گے کدھر
کتنے آگے بڑھ چکے ہیں مُڑ کے دیکھو تو سہی

مشہور ناقد و محقق رشید حسن خاں صاحب نے اختر سعید خاں کے درج ذیل شعر پر بڑی دلچسپ اور دلآویز بات کہی ہے ؎

جب بھی بیتے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہوں
کوئی آواز میں آواز ملا دیتا ہے

رشید حسن خاں کے الفاظ میں "دوسرا مصرع دل پر نقش ہو کر رہ گیا ؎

کیا کہوں کیا کیفیت سے دوچار ہوا
دوچار کیا ہوا یوں کہوں کہ سرشار ہوا

اس شعر کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس نے عرفی کا یہ شعر پڑھا ہو ؎

کسے کہ محرم باد صبا ست میداند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست

جو شخص یہ محسوس کر سکے کہ فضا میں بوئے یاسمن باقی ہے وہی اس "آواز میں آواز ملا دیتا ہے" کے لطف پنہاں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں احساس ہی کار فرما ہوتا ہے"۔

اختر صاحب احساس تمام کے شاعر ہیں۔ عصری حیثیت ہی نہیں بلکہ آفاقی حیثیت جو "نیرنگی نشاط تمنا" بن کر ان کے اشعار میں جلوہ فرما ہے۔ اختر صاحب کی مختلف غزلوں سے یہ منتخب اشعار غزل کی ابدی حیات افروز اقدار کے بیش بہا لعل و گہر کہے جانے کے مستحق ہیں ؎

کہیں ایسا نہ ہو تم نے مجھے دل سے بھلایا ہو
بہت جی چاہتا ہے ان دنوں آنسو بہانے کو
یہ کس امید پر اٹھ آئے تھے ہم ان کی محفل سے
ابھی تک تو اجل آئی نہ وہ آئے منانے کو

وہی مرحلے، وہی فاصلے وہی دشتِ تشنہ لبی مگر — کئی رنج تم نے مٹا دیے کئی درد ہم نے بھلا دیے

اختر سعید خاں

میں نے مانا ایک نہ ایک دن لوٹ کے تو آجائے گا
لیکن تجھ بن عمر جو گزری کون اسے لوٹائے گا

پھر تری بھولی ہوئی راہ گزر یاد آئی
سیکڑوں مرحلے پھر زیر قدم جاگ اٹھے

کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی تارہ کوئی پھول
اک نہ اک چیز تری یاد دلا دیتی ہے

کتنی یادیں، کتنے قصے نقش ہیں ان دیواروں پر
چلتے چلتے دیکھ لیں مڑکر کون یہاں پھر آئے گا

روٹھ جاتے تو منانا کوئی دشوار نہ تھا
وہ تعلق ہی نہ رکھیں تو منائیں کس کو
جرم کی طرح محبت کو چھپا رکھا ہے
ہم گنہگار نہیں ہیں یہ بتائیں کس کو

غزل کے قدیم و جدید رموز علائم کو ایک مخصوص تہذیبی سانچے میں ڈھال کر اختر صاحب نے میر کے الفاظ میں آفاق کی کارگہ شیشہ گری کا نازک کام انجام دیا ہے انھوں نے صنف غزل کی ادبی حدوں کا احترام کچھ اس طرح کیا ہے کہ زبان و بیان کے شعری مزاج پر گراں نہیں ہو پاتا۔ بقول ڈاکٹر محمود الہٰی "حدوں کا احترام صرف بڑے شاعروں کے حصے میں آتا ہے۔ بڑا شاعر نئے افکار و خیالات کو کلاسیکی سانچے میں اس طرح ڈھالتا ہے کہ وہ زبان کے شعری مزاج پر بوجھ نہیں بنتا۔ یہ عمل آسان نہیں ہوتا۔ اس سادہ عمل میں زبان اور شعر کے مزاج کی پاسداری بھی کرنا پڑتی ہے۔ ہر بڑا شاعر اس کو طے کرتا ہے۔

اختر سعید خاں نے غزل کے اس ہفت خواں کو بڑی خوبی سے طے کیا ہے اور اس لیے وہ یقیناً غزل کے بڑے شاعر ہیں۔ کون ہے جو ان اشعار کے طلسم سے خود کو بچا سکتا ہے۔

چبھتے نہیں ہیں آج تلک ریزہ ہائے دل
ٹوٹے تعلقات کا رشتہ عجیب ہے

الگ رہنے دو اس کو عشق کی پامال رسموں سے
یہ اک نازک سا رشتہ جس کو میں سمجھوں نہ تم جانو

اختر سعید خاں

قریب و دور کچھ پرچھائیاں سی ساتھ چلتی ہیں
نہ جانے یہ تمھاری یاد کے سایے ہیں یا تم ہو

گئی ہوں گی وہ نظریں دور تک میرے تعاقب میں
کلیجے سے لپٹ کر آ گئی ہے اک کرن اختر

اختر سعید خاں

میں اور میرا فن

میں کیا اور میرا فن کیا۔ اگر ریڈیو کے اہلِ نظر پوچھ ہی بیٹھے کہ اختر کون ہے اور خود اس کی نظر میں اس کا فن کیا ہے تو میرے لیے غالب کی طرح حیرت زدہ ہوکر یہ کہنے کی گنجائش کہاں کہ ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

ممکن ہے آپ نے میرا نام پہلے بھی اِدھر اُدھر سن رکھا ہو۔ اِدھر اُدھر سے میرا مطلب ہے شعروسخن کے ذوق سے یا حسبِ توفیق عدالت ہائے دیوانی و فوجداری کے رشتے سے۔ کیوں کہ میری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے خیر جو بھی ہے آپ میرے نام سے آشنا ہوں یا نہ ہوں میرے لیے یہ کیا کم ہے کہ آپ میرے خیالات سن رہے ہیں۔ حالِ دل نہ سہی اپنے فن کے بارے میں میرے لیے یہ کہنا تو آسان ہے کہ

کیا تمہارا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

لیکن اپنے اس فن کے بارے میں گفتگو کرنا بہت مشکل ہے آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہر تخلیقی فنکار اپنے فن کا طرفدار ہوتا ہے۔ اگر طرفدار نہ ہو تو اسے اختیار ہی کیوں کرے۔ اب اگر برسبیل تذکرہ اپنی بڑائی کا پہلو نکل آیا تو کہا جائے گا کہ اپنا قصیدہ پڑھ رہا ہوں، انکسار سے کام لیتا ہوں تو آپ کی نظروں سے بے وجہ سبک ہوتا ہوں۔ اس لیے باور کیجیے کہ اس گفتگو کا مقصد اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں ہے۔ نظم ہو یا نثر، مجھے دونوں سے نسبت ہے، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ بنیادی طور پر میں غزل کا شاعر ہوں۔ اور میرا فن غزل کے محور پر گردش کرتا ہے۔ میری نظر میں غزل شعری جمالیات کا سب سے خوبصورت اظہار ہے۔ میں غزل کو عشق کی زبان سمجھتا ہوں لیکن خود عشق کو کسی ایک جہت تک محدود نہیں سمجھتا۔ غزل کا حرف شوقِ حیات و کائنات کی تفسیر بن سکتا ہے لیکن خود حیات و کائنات کی تفسیر اس وقت تک غزل کا شعر نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ نوائے شوق نہ ہو، غزل کا شعر زندگی کی ہر آرزو

اور محرومی کی ترجمانی جس موثر انداز میں کرتا ہے وہ تاثیر دوسری اصناف سخن میں مجھے مشکل سے نظر آتی ہے۔ غزل پرانی اقدار کے حسن کی بھی پاسدار ہے اور نئے تصورات کی خوبیوں کا بھی خیر مقدم کرتی ہے۔ وہ قدیم وجدید کی آمیزش اور آویزش کو چمکاتی ہے لیکن نغمہ کوئی ہو، گاتی اپنے ساز پر ہے۔

غزل کو میں نے یا غزل نے مجھ کو کیوں اختیار کیا؟ اس کے محرکات کیا تھے؟ اس کی ابتدائی شکل کیسی تھی؟ وہ کن مراحل سے گزری اور اب کس صورت میں مجھے اپنا اسیر کیے ہوئے ہے، یہ داستان طویل ہے لیکن اس کا ذکر کیے بغیر گزارا بھی نہیں ہے۔ اس لیے بہت اختصار کے ساتھ عرض کرتا چلوں کہ غزل سے میری مناسبت فطری بھی تھی اور اس کے خارجی محرکات بھی تھے۔ فطری تعلق تو یہ تھا بچپن ہی سے مجھے ہر حسین شے سے ایک انجانا رشتہ محسوس ہوتا تھا میں ہر انجانی لطافت کو اپنی باہوں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا خارجی محرکات وہ زندگی تھی جس میں میں نے آنکھ کھولی تھی ۲، اکتوبر ۱۹۲۳ء کو میں نے جس گھر میں سورج کی پہلی کرن دیکھی وہ ایک بھرا پرا گھر تھا میرے دادا احمد سعید خاں صاحب مرحوم جاگیر اور منصب سے سرفراز تھے اور پورے کنبے کو ایک گھنے درخت کی طرح اپنے سایے میں سمیٹے بیٹھے تھے۔ بیس پچیس افراد کا کنبہ سیدھی سادی اوسط درجے کی زندگی بسر کرتا تھا۔ میرے دادا نہایت صاحب ایمان، سادہ مزاج اور مردانہ عزائم کے انسان تھے۔ وہ فارسی زبان کے منتہی اور شعر و ادب کے قدر دان تھے۔ رشتوں کی تقدیس اور شفقت و مرحمت کا پہلا سبق مجھے اسی ماحول میں ملا۔ جب وہ فالج میں مبتلا ہو کر صاحب فراش ہو گئے تو میں بارہ برس کا تھا اور اردو کسی قدر روانی کے ساتھ پڑھ لیتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے دادا مرحوم مجھ سے ہر روز کوئی نظم یا نثر کی کتاب پڑھوا کر سنا کرتے۔ اس دوران میں مجھے شاعری سے تعلق محسوس ہونے لگا۔ دادا مرحوم نے ۱۹۳۵ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا اور میرے والد حامد سعید خاں صاحب ان کے جانشین قرار پائے۔ وہ اس وقت بحیثیت شاعر و ادیب ہندستان کے ادبی حلقوں میں کافی روشناس تھے اور بقول علامہ نیاز فتح پوری اپنی ذات سے انجمن تھے۔ جاگیر سے وہ بھی سرفراز تھے۔ اور ان کا تمام وقت نواب زادوں کی ہم جلیسی اور شعر و شاعری میں بسر ہوتا تھا۔ ہندستان کے بیشتر شعرا ان کے مہمان ہوتے تھے، بھوپال کے اساتذہ اور نو آموز سب ہی ان کے گھر پر موجود ہوتے ان کے گھر کو ایک ادبی مرکز کی سی حیثیت حاصل ہو گئی تھی باوجود اس کے کہ ان کی زندگی شاعری تھی اور شاعری زندگی انھیں نام و نمود سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی اظہر سعید خاں کو اپنے پسندیدہ کلاسیکی شعرا کا کلام پڑھاتے تھے۔ ہم سمجھتے تو کچھ زیادہ نہ تھے لیکن شاعری سے ضرور رشتہ محکم ہوتا جا رہا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ باپ شاعر، نانا شریف محمد خاں حسب

لکری جو باپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، مستند شاعر، باپ کے احباب شاعر اور طرّہ یہ کہ میرے جان و دل، احسن علی خاں اور حبیب فخری شاعری کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے اب میرے شاعر بننے میں کیا کسر باقی رہ گئی تھی۔ خیر سے ہمیں ایک استاد بھی مل گئے یعنی شہر کے مشہور ادیب اور پوشیدہ شاعر مہدی میاں۔ احسن فخری، اظہر اور میں ان کے شاگردانِ رشید۔ وہ ہماری تک بندیوں کی نوک پلک سنوارتے۔ مشاعرے منعقد کرتے۔ خود صدارت فرماتے۔ ہم سب طفلان شعر بڑے ذوق و شوق سے ان کا کلام سنتے ہر چند کہ اس کی حیثیت بچوں کے کھیل سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اس کے نقوش بڑے گہرے تھے میں نے جب بھی اپنا جائزہ لیا ہے ہمیشہ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میری تعلیم و تربیت، زندگی کی تہذیب، خاندانی رشتوں کی استواری پسند و ناپسند، جمالیاتی احساس، شعر و ادب سے رشتہ، غزل سے تعلق غرض جو کچھ اور جس قدر بھی ہے۔ اس ماحول کا نتیجہ ہے جس پر میرے باپ کی مہر ثبت ہے۔ گھر کے باہر میرے لڑکپن کا ماحول بڑا سہانا تھا۔ ایک چھوٹی سی ریاست کا چھوٹا سا قصباتی شہر، ساٹھ ستّر ہزار انسانوں کی بستی، نہ شور و غل نہ ہنگامہ نہ ٹکراو نہ بلوے نہ فساد۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں چھوٹے چھوٹے غم۔ غربت و افلاس کے باوجود دلوں کی تونگری، کھیل کود، سیر و شکار۔ شعر و سخن کی محفلیں، طرحی مشاعرے گلنے، قوالیاں، لطف و تفریح کی مجلسیں، ساون کے میلے، دیوالی کے دیپ، ہولی کے رنگ، رمضان کی روحانی فضا، عید کی خوشیاں، طوفانی برساتیں، گلابی جاڑے مالوہ کی راتیں، ملی جلی تہذیبی زندگی، غرض اس بستی کی فضا کچھ ایسی تھی جیسے زندگی خود بخود گنگنا رہی ہو۔ نغمے کی عطا غزل کے سوا اور کیا ہوتی سو وہ دوسروں کے ساتھ میرے دامن میں بھی آرہی۔

ان دنوں مجھے اصغر گونڈوی کی غزلوں میں بڑی کشش محسوس ہوتی تھی جب بھی ان کے کلام کا مطالعہ کرتا ایسا محسوس ہوتا جیسے رنگوں اور روشنیوں کی فضا میں اڑ رہا ہوں۔ میں ان کا تصوف تو کچھ سمجھتا نہ تھا لیکن ان کے شعر ایسے پاکیزہ، ایسے مہذب اور ایسے باوقار نظر آتے کہ ان جیسے شعر کہہ کر مجھے اپنے والد کے سامنے پڑھتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ آصغر صاحب کی شاعری کی تہذیب اور فضائے حسن و عشق کو اختیار کرکے میں نے اپنے ہم چشموں کی نظریں اپنی غزل کا وزن و وقار بڑھا لیا لیکن اخلاقی قیود میں پابند ہو کر رہ گیا۔ عنفوان شباب کی جذباتی زندگی، دیوانگی و سرمستی، شوق وصل و شکوۂ ہجراں اور میر کی زبان میں "جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ" کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ یہ بات مجھے بہت دنوں بعد معلوم ہوئی کہ فن کو اخلاقیات کی زنجیروں میں نہیں جکڑا جاسکتا۔ ان ہی دنوں کی بات ہے جب میں اصغر گونڈوی کے فیضان کو سینے سے لگا۔ رہے

تھا اور دلّی میں پڑھتا تھا۔ جوش صاحب دلی آئے، میں اور اظہران کے سلام کو گئے۔ حسب معمول شعرا کی محفل تھی۔ حکم ہوا شعر پڑھو۔ میں نے نیاز مندانہ سر جھکا کر غزل شروع کی جب اس شعر پر پہنچا۔

وہ سامنے ہیں پردۂ ہستی اُٹھا کے دیکھ
اے بے خبر حجاب فریبِ حجاب ہے

تو جوش صاحب نے جھڑکنے کے انداز میں فرمایا، "یہ عمر اور تصوف"۔ وہ دن اور آج کا دن کہ اصغر کا مدّاح ہوتے ہوئے ان کے کوچے سے نہیں گزرا۔

لاہور کے زمانۂ تعلیم میں، میں نے ادب کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھے۔ شاعری کے جن الحاد پر نگاہ نہیں پڑی تھی وہ بھی نظر سے گزرے، نظمیں نہیں، جدید شاعری کے تیور دیکھے لیکن آسودگی کا احساس غزل کہہ کر ہی ہوا۔ اب روش یہ تھی، جو دل پر گزرے گی رقم کریں گے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس نوع کے اشعار میں احساس کا ارتعاش تو میرا اپنا تھا لیکن باقی سب کچھ اگلوں کا سرمایہ تھا۔

بے محل نہ ہوگا اگر یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ شاعری میں میرا کوئی استاد نہیں تھا۔ میں نے سیکھا سب سے لیکن کسی کے سامنے زانوئے تلمذ کبھی تہ نہیں کیا۔ میں نے سارا راستہ اپنے ذوق کی رہنمائی میں طے کیا ہے اور ذوق کی تربیت اساتذہ فن کے کلام سے کی۔ یہی وجہ ہے کہ میں شاعری کو فن سے الگ کرکے کبھی نہیں دیکھتا۔ میں زبان، محاورے لفظ کے استعمال میں بہت محتاط رہتا ہوں پیرایۂ اظہار کی جدّت کو شعر کے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اپنے لیے مترنم بحروں کا انتخاب کرتا ہوں۔ نامانوس اور لڑکھڑاتی بحروں میں شاعری تو کی جاسکتی ہے لیکن احساسات، کیفیات اور خیالات کو اثر انگیز نہیں بنایا جاسکتا۔ مجھے شعر میں لفظوں کا دبنا اور گرنا یا ٹوٹنا پسند نہیں ہے۔ میں شاعری کو محض استعارہ تو نہیں مانتا لیکن تشبیہ پر استعارے کو ترجیح دیتا ہوں۔ سادہ بیانی اور پُرکاری دونوں کا قائل ہوں بشرطیکہ شعر میں کوئی بات ہو۔ ہوسکتا ہے کہ میری باتوں کو روایت کی پاسداری پر محمول کیا جائے لیکن میں روایت کے لفظ سے نہ گھبراتا ہوں نہ خجل ہوتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ آگے بڑھنے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھنا ضروری ہوتا ہے اور یہی مڑ کر دیکھنا شاعری کو روایت سے وابستہ کرتا ہے جو لوگ روایت کے منکر ہیں وہ بھی کسی نہ کسی معنی میں روایت سے منسلک ہوتے ہیں۔ میں نے ترقی پسندی کا مفہوم علی گڑھ میں سمجھا۔ یونی ورسٹی کی تعلیمی اور اقامتی زندگی نے مجھے نگاہ عطا کی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، جذبی صاحب کی رہنمائی اور نکتہ سنجیاں، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر خورشید الاسلام اور دوسرے

علم دوست احباب کا فیضان صحبت میرے کام آیا۔ ۱۹۴۶ میں بھوپال واپس آیا تو میرا ذہن مہر و وفا کی حکایات کے ساتھ زندگی کے بہت سے سوالوں کو سمیٹے ہوئے تھا جنھیں میری غزل کا موضوع بننا تھا۔ بھوپال میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہو چکی تھی اور بھوپال کے بیشتر ادیب اور شاعر اس کے رکن تھے۔ انجمن سے میرا ربط ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا جو آج تک ہے۔ ترقی پسند ادب کیا ہے اس پر یہاں گفتگو کا موقع ہے نہ وقت۔ ترقی پسند تحریک زندہ ہے یا ختم ہوگئی۔ یہ بات اتنی قابل اعتنا نہیں ہے جتنی یہ حقیقت کہ ادب میں ترقی پسندی ایک رویّہ بن گئی ہے۔ یہی رویہ میری غزل کا MOTIVE FORCE ہے اور اسی رویے کی شعری تہذیب میرا فن ہے۔ غزل میں زندگی کی طرف دیکھنے کے ترقی پسند رویّے کو میں نے جمالیاتی آداب سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ جمالیات کا زندگی سے گہرا رشتہ ہے اور فنکار کا عمل یہ ہے کہ وہ پہلے حسن کو اپنے تصور میں لاتا ہے، پھر اس کی تشکیل کرتا ہے۔ حسن کو تصور میں لانے والی تخلیقی صلاحیت اور اس صلاحیت کو کام میں لانے والی فنّی استعداد کے لیے ضروری ہے کہ ان میں مکمل وحدت ہو۔ اب اگر یہ وحدت ہے تو فنکار باکمال ہو جاتا ہے اور اگر تخلیقی صلاحیت یا فنّی استعداد میں سے کوئی ایک کم ہے تو تخلیق میں ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے۔

غزل کا فن نرم آنچ سے جلا پاتا ہے، بھڑکتے ہوئے شعلوں سے نہیں۔ غزل قدیم ہو یا جدید اس کی اپنی تہذیب ہے۔ وہ اشاروں اور کنایوں میں بات کرتی ہے۔ اونچی آواز میں نہیں بولتی اس کا کمال گویائی برہنہ حرفی نہیں ہے۔ پیام زیر لبی ہے۔ غزل کا فن نہ سینہ کوبی ہے نہ قہقہہ لگانا۔ وہ ایک آنسو ہے پلکوں پر ٹھہرا ہوا۔ ایک تبسّم ہے ہونٹوں پر پھیلا ہوا۔ کبھی اس کے تبسم میں اشکوں کی نمی ہوتی ہے اور کبھی اشکوں میں تبسّم کی جھلک۔

میری غزل میں فن کی پاسداری مکمل طور پر پائی جاتی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ تو اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ غزل کے ہزار شیووں میں سے چند ایک کا ادا شناس ہوں۔

غزلیں

غزل

[illegible]

پھر کسی مہ گل کی یاد شمع سی اک جلا گئی
آپ بھی جگمگا اٹھی مجھ کو بھی جگمگا گئی

جس کو سمجھ رہا تھا میں ایک نگاہ سرسری
سارے وجود کو مرے درد سے دل بنا گئی

اس کی وہ اک ادا میں تھا میرے سوال کا جواب
آنکھ بھی جھک کے رہ گئی لب پہ ہنسی بھی آ گئی

زخم نگاہ کے سوا اہل نظر کا کیا رہا
نکہت زلف خم بہ خم خواب تو کچھ دکھا گئی

اتنا دکھا ہوا ہے دل خود ہمیں یہ گماں نہ تھا
رات ذرا سی چشم نم سیل بلا اٹھا گئی

کتنے چراغ تشنۂ رنگ ہوئے اک ہوا خبر
شمعیں جلانے آئی تھی باد صبا بجھا گئی

کس کی رہگزر میں ہے گرم خرام زندگی۔ گزری ہے جس مقام سے نقش قدم بنا گئی

اختر سعید

بخطِ شاعر

غزل

انکار ہو کہ درد کا اقرار کچھ تو ہو
اے دل زبانِ حال سے اظہار کچھ تو ہو

یہ تیرگیٔ شب سحر آثار کچھ تو ہو
اختر دکھائے اب درِ رخسار کچھ تو ہو

ایسا بھی کیا کہ اب نہ ہنسی ہے نہ آنکھ نم
مفہومِ جنبشِ لبِ گفتار کچھ تو ہو

قیمت متاعِ جاں کی اجل آ کے کیا بڑھی
سودا یہ زندگی کا ہے تکرار کچھ تو ہو

کیوں یوں ہی نامراد رہے زندگی کا دم
مقتل میں جشنِ مستیٔ کردار کچھ تو ہو

ہر سانس کا خراج ادا کر رہا ہوں میں
اے زندگی کے درد کم آزار کچھ تو ہو

اختر ہمارے سوچ کے کیا تو نے زہرِ غم
دیوانہ ہو کہ آدمی ہشیار کچھ تو ہو

۱

لبِ سکوت پہ اک حرفِ بے نوا بھی نہیں
وہ رات ہے کہ کسی کو سرِ دُعا بھی نہیں
خموش رہیے تو کیا کیا صدائیں آتی ہیں
پکاریے تو کوئی مُڑ کے دیکھتا بھی نہیں
جو دیکھیے تو جلو میں ہیں مہر و ماہ و نجوم
جو سوچیے تو سفر کی یہ ابتدا بھی نہیں
قدم ہزار جہت آشنا سہی لیکن
گزر گیا ہوں جدھر سے وہ راستہ بھی نہیں
کسی کے تم ہو! کسی کا خدا ہے دُنیا میں
مرے نصیب میں تم بھی نہیں خدا بھی نہیں
یہ کیسا خواب ہے پچھلے پہر کے سناٹو
بکھر گیا ہے اور آنکھوں سے چھوٹتا بھی نہیں
اس اژدحام میں کیا نام، کیا نشاں اختر
ملا وہ ہنس کے مگر مجھ سے آشنا بھی نہیں

۲

قصۂ حشر پہ حیرت کیا ہے
ہم نے دیکھی ہے قیامت کیا ہے

اک ذرا دیکھ مری آنکھوں میں
زندگی تیری حقیقت کیا ہے

دل کو خوں کرنا تو آتا ہے ہمیں
دل کے بہلانے کی صورت کیا ہے

تم سے پیمانِ وفا باندھا ہے
اور اندوہِ محبت کیا ہے

آنکھ کھلتی ہے بکھر جاتے ہیں
اور خوابوں کی حقیقت کیا ہے

پوچھتا ہے کفِ قاتل سے لہو
مجھ سے لوگوں کو عداوت کیا ہے

گھر جلا اس کا بدل دے دیجے
چھوڑیے جان کی قیمت کیا ہے

ہم ہیں اور دانشِ ماضی کا عذاب
عہدِ نو تیری بشارت کیا ہے

سرِ شوریدہ سلامت اختر
بارشِ سنگِ ملامت کیا ہے

۳

عشق میں ترکِ رسمِ جنوں پر لوگ نہ دیں الزام بہت
ان کے بھی کچھ اپنے غم تھے ہم کو بھی تھے کام بہت

سارے قصّے مہر و وفا کے دل سے محو ہوئے لیکن
جب بھی کوئی کسی سے بچھڑا، یاد آیا اک نام بہت

صبحِ سفر سے شامِ سفر تک اپنی تو روداد یہ ہے
صحرا صحرا دھوپ بہت تھی گلشن گلشن دام بہت

اس موسم میں اپنے سوا کیا چاک گریباں کوئی نہیں
کل تک تو دیوارِ چمن پر لکّھے ہوئے تھے نام بہت

اُجڑے پر بھی اس بستی میں خوشبو ہے دلداری کی
بھولے بسرے یار بہت ہیں بچھڑے ہوئے اصنام بہت

دیکھیے اب کے مقتلِ جاں میں چھیڑ کدھر سے ہوتی ہے
موج لہو کی اوج پہ ہے اور تیغ ہے خوں آشام بہت

اختر تیری فکر و نظر پر ہم کو بھی ہے ناز مگر
فکر و نظر کے سایے سایے پلتے ہیں اوہام بہت

۴

بہت طویل سفر تھا یہ طے ہوا کیسے
ترے بغیر یہاں تک میں آگیا کیسے

بلا تھی ساعتِ اول سے انتظار کی شام
نہ جانے آخرِ شب دل ٹھہر گیا کیسے

نہ سحرِ فن، نہ کرشمہ طراز تھا وہ شخص
میں ایک عمر تماشا بنا رہا کیسے

وہ ماہ تھا، نہ ہوائے بہار کا جھونکا
نہ جانے پھر مجھے دیوانہ کر گیا کیسے

بس ایک لحظہ میں اس در پہ جا کے بیٹھا تھا
اٹھا تو بھول گیا گھر کا راستا کیسے

معاملہ تو غمِ دل کا اب کھلا ہے کہیں
ہوا میں پہلے پہل درد آشنا کیسے

ہزار ٹھوکریں ایک ایک سنگِ راہ میں تھیں
سنبھالتی مجھے عمرِ گریز پا کیسے

یہ مجھ سے پوچھو، مرے نامراد دل سے نہ پوچھ
گزارتا ہے کوئی عمر بے خدا کیسے

۵

نہ صبحِ گل ہے مداوا، نہ سیرِ جلوۂ ماہ
جو زخم دل کے ہرے تھے ہرے ہیں بار الٰہ

چمن سے آخری پھولوں کا قافلہ بھی گیا
میں دیکھتا رہا نادیدہ موسموں کی راہ

کھٹک رہی ہے رگِ جاں میں کوئی شے لیکن
نہ آہِ دل کو خبر ہے نہ آبِ دیدہ گواہ

ٹپک رہی ہے اُن آنکھوں سے پیار کی شبنم
مگر یہ ایک سُلگتا سا دل خدا کی پناہ

یہ رنگ و نور کی بارش، یہ بجلیوں کا خرام
درِ طلسم کھُلا ہے کہ اس کی چشمِ سیاہ

بہت ہے دہر میں بارِ حیات اٹھانے کو
ترا تبسّمِ لب، تیری محرمانہ نگاہ

سجائے بیٹھا ہوں خوابوں کی انجمن اخترؔ
اسی دیار میں جس میں ہر آرزو ہے گناہ

۶

خواب بکھر کے رہ گئے، نیند اُچٹ کے رہ گئی
اک اُداس شام پھر، دل سے لپٹ کے رہ گئی

تیرے شہیدِ ناز کا اُف وہ تبسّمِ حزیں
چارہ گروں کا ذکر کیا، موت بھی کٹ کے رہ گئی

شرحِ جمالِ کائنات کرنے اٹھی تھی زندگی
اٹھی تو دفعتاً ترے رُخ پہ سمٹ کے رہ گئی

میری شعارِ جستجو میری نگاہِ بے قرار
وہ بھی تصوّرات کے پردے اُلٹ کے رہ گئی

اب یہ بیاضِ دل کے ساتھ چھیڑ سی کیا ہوا کی ہے
کوئی ورق اڑا گئی، کوئی پلٹ کے رہ گئی

منزلیں بے نشاں نہ تھیں اس کا مگر علاج کیا
تھی جو وہ اک دلوں کی راہ گردیں اٹ کے رہ گئی

راہ کے پتھروں کا اب ہم بھی شمار کیا کریں
پانو بھی تھک کے سو گئے عمر بھی کٹ کے رہ گئی

۷

تم ہو یا چھیڑتی ہے بادِ سحر کوئی تو ہے
کھٹکھٹاتا ہے جو یہ خواب کا در کوئی تو ہے

دل پہ پڑتی ہوئی دُز دیدہ نظر کوئی تو ہے
جس طرف دیکھ رہا ہوں میں اُدھر کوئی تو ہے

ایسے ناداں نہیں راتوں میں بھٹکنے والے
جاگتی آنکھوں میں خورشیدِ سحر کوئی تو ہے

کس کا منہ دیکھ رہی ہے سفر آمادہ حیات
سُوئے مقتل ہی سہی راہ گزر کوئی تو ہے

تو مجھے دیکھ مرے پاؤں کے چھالوں کو نہ دیکھ
زندگی تیرے لیے خاک بسر کوئی تو ہے

خود بخود ہاتھ گریباں کی طرف اٹھتے ہیں
سرسراتی سی ہواؤں میں خبر کوئی تو ہے

دن کٹا سارا خرابوں میں بھٹکتے اختر
شام ہوتی ہے چلو خیر سے گھر کوئی تو ہے

۸

وہ دل فریب دُھندلکے، وہ دل نشیں اوہام
پھر ان کو ڈھونڈنے نکلی ہے گردشِ ایام
ارے یہ خواب تو رہنے دو میری آنکھوں میں
سکوں کی نیند تو مدّت سے ہو چکی ہے حرام
یہاں تو موت بھی اک جُرم تھی حیات بھی جُرم
میں اپنے سر پہ لیے چل دیا ہر اک الزام
ہر ایک تلخیِ غم کا جواب ہوں جیسے
یہ تیری یاد کے سایے یہ تیری درد کی شام
میں سن رہا تھا دلِ کائنات کی دھڑکن
خموشیوں میں تھی جب رات خود سے محوِ کلام
وہ صبح و شام خدا جانے کیا ہوئے کہ جو تھے
مرے جنوں کے تری زلفِ مشکبار کے نام
بہت دنوں سے کسی اور دُھن میں ہے اختر
بہت دنوں سے کسی سے سلام ہے نہ پیام

۹

جس کو عزیز ہو، اُسے مملکتِ بہار دے
چبھ کے جو دل میں ٹوٹ جائے مجھ کو وہ نوکِ خار دے

آخرِ شب بھی ہیں وہی وہم و گماں کی آہٹیں
آ مرے انتظار کو صورتِ اعتبار دے

شام سے ہے سرِ مژہ ایک چراغ ضو فگن
بجھنے سے پہلے یہ چراغ دل میں مرے اُتار دے

میرے سفر کی منزلیں اُجڑے دلوں کی بستیاں
خضرِ خجستہ گام کو سبزہ و جوے بار دے

عشقِ جنوں پسند کو راحتِ جاں نہیں قبول
پھر مجھے بے قرار کر، پھر دلِ بے قرار دے

کون پسِ نقاب ہے تو ہے کہ میری آرزو
اب یہ نقاب تو اُٹھا یا مجھے اختیار دے

۱۰

القصّہ یہ حال ہوگیا ہے ہر خواب خیال ہوگیا ہے

پہلے بھی بہت کٹھن تھا جینا اب کارِ محال ہوگیا ہے

کس کس کو جواب دے گی دُنیا ہر چہرہ سوال ہوگیا ہے

اے رقص کُناں موسمِ گُل سبزہ پامال ہوگیا ہے

کچھ دل سے لگاو رہ گیا تھا سُو وہ بھی وبال ہوگیا ہے

آنکھوں میں مری سمٹ کے وہ گل عنوانِ جمال ہوگیا ہے

برسی جو گھٹا تو صحنِ گلشن ق اُس رُخ کی مثال ہوگیا ہے

ہر گُل، ہر پتّہ، ہر شگوفہ شرحِ خدوخال ہوگیا ہے

مٹ کر تری آرزو میں اختر

اک نقشِ کمال ہوگیا ہے

۱۱

دیکھنے والے سکوتِ چشمِ تر بھی دیکھ لیں
جس طرف دیکھا نہیں جاتا اُدھر بھی دیکھ لیں
وہ تو ہم سمجھے ہوئے ہیں جو ہیں تیور درد کے
آپ اگر چاہیں تو سعیِ چارہ گر بھی دیکھ لیں
کس طرف لے جا رہی ہیں روز و شب کی گردشیں
کوئی واقف ہو تو اس سے پوچھ کر بھی دیکھ لیں
چھوڑ آئے ہیں جہاں کچھ جاگتی آنکھوں کے خواب
چلتے چلتے اک نظر وہ رہگزر بھی دیکھ لیں
زندگی کب تک یہ اک بے رنگ سی یکسانیت
کوئی عالم ماورائے خیر و شر بھی دیکھ لیں
طائرانِ بستہ پر کی جنبشِ پرواز کیا
خیر، احوالِ شکستِ بال و پر بھی دیکھ لیں
صبح کی پلکوں پہ اک ٹھہرا ہوا آنسو ہوں میں
جاگنے والے مری شب کی سحر بھی دیکھ لیں

۱۲

دیکھ تو شہر میں اک تیرہ شبی سی کیوں ہے ・ تیرے ہوتے یہ اجالوں میں کمی سی کیوں ہے

گل ہوا ہو نہ سرِ شام کسی گھر کا چراغ ・ شب کے سنّاٹے میں اک چیخ دبی سی کیوں ہے

دل کی رگ رگ سے کھنچا آتا ہے آنکھوں میں لہو ・ دل کی رگ رگ میں یہ اک چوٹ دبی سی کیوں ہے

تیرا ملنا کہیں تمہید بچھڑنے کی نہ ہو ・ تجھ سے مل کر مری آنکھوں میں نمی سی کیوں ہے

نہ کوئی دید، نہ وہ ساعتِ دیدار کے رنگ ・ اب یہ آنکھوں کو پریشاں نظری سی کیوں ہے

لوگ کہتے ہیں کہ ہمسائے میں آیا ہے کوئی ・ میرے غم خانے کی ہر چیز نئی سی کیوں ہے

عمر ہم نے بھی گزاری ہے تری راہوں میں ・ زندگی ہم سے یہ بیگانہ وشی سی کیوں ہے

تم سے پوچھوں کہ مہ و مہر کی تابانی سے ・ دل وہی دل ہے تو افسردہ دلی سی کیوں ہے

زخم تو سینہ و سر پر بھی ہیں لیکن اختر
چوٹ جو دل کی ہے برچھی کی انی سی کیوں ہے

۱۳

سہل مت جانیے ہجراں میں گزر کرنے کو
عمر درکار ہے اس شب کی سحر کرنے کو

اب کسی رُخ پہ ٹھہرتی ہی نہیں ہیں نظریں
کھیل سمجھے تھے ترے رُخ پہ نظر کرنے کو

اک ترا غم ہے کہ شاداب ہے ہر موسم میں
ورنہ کیا رکھا ہے دنیا میں بسر کرنے کو

آتے آتے ہی تو ہم آئیں گے تیرے نزدیک
دور کی راہ سے نکلے ہیں سفر کرنے کو

کن سمن زاروں سے گزرے گی صباب کے برس
اس طرف بھی تو کوئی آؤ خبر کرنے کو

سرزمیں دل کی نہ تھی قتل گہِ ارماں تھی
ہم بھی یاں آئے تھے اک معرکہ سر کرنے کو

موجِ خوں دیدۂ پُرنم کو عطا ہو یارب
حوصلہ کچھ تو ملے، عرضِ ہنر کرنے کو

۱۴

ہر ایک بچھڑا ہوا درد والہانہ ملا
ضرور آج کوئی دل سے غائبانہ ملا

نہ جانے بزمِ حریفاں میں تذکرے کیا تھے
کہ آج جو بھی ملا ہم سے ناصحانہ ملا

الٹ دیا ہے زمیں پر کہ پیاس سے کم تھا
وہ جامِ جم بھی جو مستوں کو فاتحانہ ملا

کھُلا کہ برق کے سایے میں چار تنکے تھے
سمجھ رہے تھے کہ پھولوں میں آشیانہ ملا

زمینِ دل نہ چمن تھی نہ فرشِ پا انداز
ترے خرامِ قیامت کو کیا بہانہ ملا

اٹھا کسی سے نہ بارِ الم! نہ بارِ حیات
تھکا تھکا سا ترے عہد میں زمانہ ملا

سکوتِ اہلِ سخن کا وہاں گِلا کیسا
مری نوا کو جہاں سوزِ جاودانہ ملا

اختر سعید خاں

سید سلیمان ندوی کا شعری آہنگ

علامہ سیّد سلیمان ندوی کے شعری آہنگ سے پہلے پہل میری شناسائی جس سحر آفریں عبارت سے ہوئی تھی وہ ایک 'نووارد شاعر' کا تعارف تھا۔ میں نے یہ تحریر عمر کے ہر دور اور زبان و ادب کے ہر موڑ پر پڑھی ہے لیکن اس کے طلسم سے آج تک آزاد نہیں ہوسکا ہوں، فرماتے ہیں "جی چاہا شاعر صاحب سے کچھ سنا جائے اور ان کے دعوا   سخنوری کا امتحان لیا جائے، سب کی نظریں ایک خاص تبسم کے ساتھ شاعر کی طرف اٹھیں مگر اس نے ماحول سے بے پروا ہوکر ایک عجیب درد انگیز ترنم، مست لہجے اور سرشار انداز میں ایک غزل کا ترانہ چھیڑا، ایک دو شعر پڑھے تھے کہ سب کو سنبھل جانا پڑا۔ ذہن کی رو کو ظرافت سے متانت کی طرف پھیرنا پڑا، تبسم کی نگاہ میں تحیّر پیدا ہوا، سامعین کے لبوں میں لرزش پیدا ہوئی، لرزش آوازیں اور آوازا حسنت و مرحبا کی صدائے تحسین میں بدل گئی۔ نووارد نمائش اور داد طلبی کی ہر ادا سے بے نیاز، دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود سراپا اثر بن کر جب سامنے آیا تو مصر سخن کے سب جادوگر یک دفعہ چلا اٹھے آمنا برب ہارون و موسیٰ، یہ کلیم سخن کون تھا؟ جگر مرادآبادی، شاعر ایک تھا مگر اس کے اثر نے ہر خاموش کو شاعر اور ہر شاعر کو خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا متوالا ہے اور عشق   حقیقی جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو اور صنم خانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہوکر بزمِ ساقی کوثر تک پہنچنا چاہتا ہے۔"

یہ نثر نہیں شعر ہے، اور شعر بھی غزل کا، غزل جو اردو زبان کی شناخت بھی ہے اور وقار بھی، یہ چہکتی ہوئی فکر اور لہکتا ہوا انداز نگارش ایک ایسے خلاق ذہن کا آئینہ دار ہے جو کارگاہ عالم میں قدرت کی طرف سے شاعر کا دل لے کر آتا ہے اور ابدیت کے اوراق پر نقوشِ دوام چھوڑ جاتا ہے۔

"نقوشِ سلیمانی"، کا مصنف طبعاً شاعر تھا اور اس کے چھوڑے ہوئے ہر نقش میں شعریت کی زیریں لہر رخشاں و رقصاں نظر آتی ہے"۔ "سیرۃ النبیؐ"، "سیرت عائشہؓ" اور "حیاتِ مالک"، کے مصنف اور بقول علامہ اقبال، "علوم اسلامی کی جوئے شیر کے فرہاد" کے شاعر ہونے پر تعجب کا مقام نہیں۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتا تو تعجب ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ اہل علم نے علوم دینیہ اور فلسفہ و حکمت کے مقابلے میں شعر کو کم رتبہ قرار دیا ہے، اور شاید اسی لیے علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی نے شاعری کو اپنے دسترخوان علم و فضل کی چٹنی سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور اسی لیے سید صاحب نے جس طرح اپنے دور کمالات علمی کو درجۂ استناد تک پہنچا دیا، شاعری کو پایہ اعتبار تک پہنچانے کے قابل نہیں سمجھا۔ تاہم ایک بیدار دل اور دراک ذہن جب کسی فن کی شاہراہ سے سرسری بھی گزرتا ہے تو اس کے قلم کا خرام گل کتر جاتا ہے۔

سید صاحب نے عنفوان شباب میں شاعری کی وادی میں قدم رکھا، جب بقول میرؔ ع

میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

لیکن وہ ندوۃ العلماء کے طالب علم تھے جس کا ماحول علمی اور دینی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، دوسری طرف لکھنؤ کی مروجہ غزل تھی جو یک قلم خارج آداب وقار و تمکین ان کی تربیت ذہنی اور تہذیب نفس کی گہوارہ جنبانی ندوہ کے ہاتھوں میں تھی، لیکن ان کے کانوں میں امیر اور ان کے متبعین کی آوازیں گونج رہی تھیں ع ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر، کے مصداق یہ زمانہ سید صاحب کے لیے بڑی کشمکش کا رہا ہوگا۔ یہ باور کرنا تو محال ہے کہ جب وہ یہ کہہ رہے تھے ع

پہلے تو چھیڑتے تھے تصور میں بار بار اب کیوں شبِ وصال میں شرمائے جاتے ہیں

یا

اڑا لیتے ہو دل تم عاشقوں کا باتوں باتوں میں نیا انداز سیکھا ہے یہ تم نے دل اڑانے کا

تو دورِ ایام جوانی، "چنانکہ افتد و دانی"، کا مرحلہ درپیش تھا، یا ہوائے شوق کا کوئی جھونکا ان کا گہوارہ ہلا جاتا تھا لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ لکھنؤ کے عام مذاق شعری خصوصاً امیر مینائی کے رنگ تغزل نے سید صاحب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کے یہ اشعار:

بجلی کی طرح قبر پہ آئے چلے گئے
اب تک ہمارے دل کو وہ تڑپائے جاتے ہیں

دستِ نازک سے اٹھاتے ہیں وہ میت میری
بعد مرنے کے ٹھکانے لگی محنت میری

امیر سے شیفتگی کی یادگار ہیں۔ ان اشعار میں تو سید صاحب نے توازن واعتدال کو برقرار رکھا ہے لیکن لکھنوی مذاق شعری کی شوخی اور خارجی معاملات حسن وعشق انھیں وہاں تک کھینچ لے گئے، جہاں ان کے قلم سے اس قسم کے شعر نکل گئے ہیں

کل شب مرے نہ آنے سے خفگی سہی مگر
ہے کیوں نگاہ ناز مگر شرمسار آج

دست گستاخ کو اجازت دو
منہ سے کھل کر کہا نہیں جاتا

وہ رفتہ رفتہ اور بھی دیں گے اجازتیں
ان کے گلے میں ہاتھ حمائل تو ہوگئے

سوال یہ ہے کہ یہ بے جھجک واقعہ نگاری اور انجانے درو بام سے ٹکرا کر واپس آنے والی صدائیں سید صاحب کے تصرف میں کس طرح آئیں؟ اس کا جواب بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ شاعری کی دنیا میں ایک نووارد کو کچھ دن اسی باغ کی سیر کرنی ہوتی ہے جس کے سبزے کی لہلہاہٹ پر خاص وعام لوٹ پوٹ ہوتے ہیں، اور انھیں آوازوں میں آواز ملانی ہوتی ہے جو اپنے عہد میں فردوس گوش ہوتی ہیں۔ خود اقبال جیسے عظیم مفکر نے جب شاعری کی ابتدا کی تو شاگردی داغ کی اختیار کی اور اسی رنگ میں شعر بھی کہے ع

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

تمھارے پیامی نے سب راز کھولے
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

آج کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ اشعار اسی اقبال کے ہیں جو طلوع اسلام، خضر راہ مسجد قرطبہ، ذوق وشوق، میلاد آدم، ساقی نامہ اور ابلیس کی مجلس شوریٰ جیسی لافانی نظموں کا خالق ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ادب اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے اور زمانہ اپنے شاعروں اور ادیبوں کے قلم سے اپنی تاریخ آپ مرتب کرتا ہے، لکھنؤ کی تاریخ گہرے اور شوخ رنگوں سے مرتب ہوئی تھی۔ دلی جب اجڑ رہی تھی تو لکھنؤ آباد ہو رہا تھا، دلی میں جب یہ عالم تھا کہ ع

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج وتخت کا

تو لکھنؤ سے آواز آرہی تھی:

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو
ہر اک گھر خانۂ شادی ہے ہر اک کوچہ ہے عشرت کا

لکھنؤ میں ان دنوں بسنت برس رہا تھا اور دولت کی فراوانی نے تعیش کی راہیں کھول دی تھیں۔ پورا معاشرہ عیش کوشی اور لذت اندوزی کو زندگی کا اصل مقصد سمجھے ہوئے تھا۔ شاعری پر اس کے جو اثرات پڑنے تھے وہ قدرتی طور پر پڑ کر رہے۔ ہر چند کہ میر اور سودا اس دور میں دلی سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ آ بسے تھے اور فن شعر میں اہل لکھنؤ ان کی عظمت کے قائل تھے، لیکن لکھنویت نے نہ میر کے عرفان غم کو قبول کیا نہ سودا کی دیدہ وری کو۔ معاشرے کی خوش فعلیوں اور رنگ رلیوں نے شاعری میں داخلیت کو خارجیت اور فطرت کو صنعت سے بدل دیا۔ اور زبان کو سادگی و برجستگی کے بجائے تکلف و تصنع کا لباس پہنا دیا اور اب یہی شعر کا معیار قرار پایا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اودھ کی سلطنت اس کے حکمرانوں کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن اودھ کے شعرا کے ہاتھ سے لکھنوی رنگ تغزل کی زمام نہ چھوٹی۔ شاعری بادشاہوں کی سرپرستی سے نکلی تو تعلقہ داروں اور جاگیرداروں کے زیر سایہ آگئی اور پھر حسرت موہانی کے عہد تک اس نے اپنے معانی و بیان سے انحراف نہیں کیا، اپنی بگڑی ہوئی جمالیاتی شکل اور خارجی متعلقات حسن و عشق کے بیان کے باوصف لکھنوی رنگ تغزل معاشرے میں اس درجہ رچ بس گیا تھا کہ وہ محفل رنداں ہی میں نہیں، صلحا کی مجلسوں میں بھی بار پا چکا تھا۔ جب کوئی اسلوب سخن اس درجہ پایۂ اعتبار کو پہنچ جائے تو تازہ واردان بساط شعر کا خود کو معتبر ٹھہرانے کے لیے اسے اختیار کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ سید صاحب کے ابتدائی رنگ سخن کو ہم تقلیدی اور رسمی شاعری کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے اس نوع کے اشعار میں اس معاشرے کے خد و خال کو دیکھا جا سکتا ہے جو معاشرہ کبھی تھا اور جس نے ہماری تہذیبی اقدار کی تعمیر اور تخریب میں اہم رول ادا کیا ہے۔

سید صاحب نے ۱۹۰۴ء میں شاعری شروع کی تھی اور ۱۹۱۴ء تک وہ داغ اور امیر کے اثرات سے آزاد نہ ہو سکے۔ لیکن دس سال کی ابتدائی مشق کے بعد انھوں نے اس رنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس عرصہ میں وہ علمی دنیا میں روشناس ہو چکے تھے۔ انھوں نے علم کو محض علم کے لیے حاصل نہیں کیا تھا اور نہ یہ ان کا عقیدہ تھا۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور انھوں نے اپنی روشن خیالی کے چراغ زندگی کے راستوں میں جلانا شروع کر دیے تھے۔ ان کی شاعری اب بھی ضمنی حیثیت رکھتی تھی لیکن اس کی صورت بدل چکی تھی۔

علمائے فرنگی محل کے اثر و نفوذ اور دوسرے علما کی مساعی سے علوم قدیم کے احیا نے معاشرے کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اور شاعری پر بھی اس کا خاطر خواہ اثر مرتب ہوا، شعر و ادب کی زبان میں تبدیلیاں آئیں، اور موضوعات میں تنوع پیدا ہوا، مذہبی تصورات جو تصوف کے ذریعہ ابتداً اردو شاعری میں داخل ہوئے تھے اور لکھنویت نے جنھیں خارج از شعر قرار دے دیا تھا، دوبارہ نظر آنے لگے۔ قومی حمیت اور ملّی احساسات جن سے شعرا کا رشتہ ٹوٹا ہوا تھا، شعر میں اپنی جگہ بنانے لگے۔ حسن و عشق کے فطری جذبات نے خارجی لوازم کو خیرباد کہنا شروع کر دیا، تشبیہ و استعارہ، اشارت و کنایت سب میں وزن و وقار پیدا ہونے لگا۔ یہاں تک رسم عاشقی کے آداب بدلنے لگے، تو سید صاحب نے طرز کہن پر اڑنے کے بجائے خود کو نئے اسلوب سخن میں ڈھال لیا۔ اب ان کی سیرگاہ آمیر کا صنم خانہ عشق نہ تھی، غالب کا شہر آرزو تھا جہاں یہ دشتِ امکان تمنا کے ایک قدم سے زیادہ نہ تھا ؎

عجب طرح کا یہ اک پیچ گفتگو میں ہے
وگرنہ "میں" میں وہی بات ہے جو "تو" میں ہے

ہے کائنات کا ہر ایک ذرّہ گردش میں
پتا جو مل نہ سکا تیری جستجو میں ہے

ان اشعار کا آہنگ وہی ہے جو غالب کے فکر انگیز اشعار کا ہے، اور ان میں وہی بصیرت ہے جو غالب کی متاع ہے۔ پہلے شعر میں من و تو کے امتیاز کو گفتگو کا پیچ کہہ کر سید صاحب نے اس قدیم بحث کا رخ بڑے اچھوتے اور شاعرانہ انداز میں موڑ دیا ہے۔ بحث اب 'من و تو' کی نہیں اس پیچ کی ہے جو گفتگو میں پڑ گیا ہے۔ دوسرے شعر میں وہ غالب کے قریب سے ہو کر گزر گئے ہیں غالب کا شعر ہے۔

ہے کائنات کو حرکت ترے ذوق سے
پرتوسے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

اسی غزل میں سید صاحب نے ایک شعر ایسا کہہ دیا ہے کہ اگر وہ کچھ اور نہ کہتے تو بھی یہ شعر انھیں ایک شاعر کی حیثیت سے زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا فرماتے ہیں ؎

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

اس کرۂ ارض پر جب سے انسان کے شعور نے آنکھ کھولی ہے اور حق و باطل کے

فرق کو محسوس کیا ہے اور جب سے اس کے خونِ گلو نے حق کی حمایت سیکھی ہے اسے صداقت کے قاتل مقتل میں کھینچ لے گئے ہیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ع بوئے گل ٹھہری ہے نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے، یہ تصادم آج بھی جاری ہے اور اس شعر کی معنویت، تاثیر قطرۂ خوں کو رگ گلو میں موجزن رکھنے کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔

میر تقی میر نے تہذیب عشق کا ایک بڑا ہی خوبصورت مرقع پیش کیا ہے۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

اس کے برعکس سید سلیمان کے اضطراب دل کا یہ عالم تھا کہ ع

چلین سے بیٹھنے دے گی نہ یہ ہم دونوں کو
تجھ کو یہ شوخی تری مجھ کو یہ وحشت میری

لیکن ۱۹۲۷ء تک پہنچتے پہنچتے ان کے تمکین و ضبط کی کیفیت یہ ہے ع

تمھیں کو کس طرح میری محبت کا یقین آئے
قسم تک تو تمھارے نام کی میں کھا نہیں سکتا

لب خاموش بھی بیگانہ ہے راز درونی سے
کوئی حرف اس تمنّا کا لبوں تک آ نہیں سکتا

جو تنہائی بھی حاصل ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا
کہ صورت دل کی خلوت میں بھی میں دکھلا نہیں سکتا

یہ اشعار صرف تہذیب عشق کے پاسدار نہیں ہیں، فطری جذبات کا موثر اظہار ہیں، اور محبت کرنے والے دلوں کو دھڑکنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔

سید صاحب کی شاعری کی عمر جیسے جیسے بڑھتی گئی ان کے جذبات میں متفکرانہ ضبط اور خیالات میں رفعت پیدا ہوتی گئی ہے، ان کا پیرایہ اظہار زیادہ صاف اور برجستہ ہوگیا ہے اور زبان و بندش میں زیادہ صفائی اور حسن نظر آتی ہے۔ ۱۹۳۸ء اور اس کے بعد کے چند اشعار دیکھیے۔

عقل کہتی ہے کہ ناداں نہ ہو گمراہ نہ ہو
عشق کہتا ہے کہ کیا لطف اگر چاہ نہ ہو

یہ دل وہ شیشۂ نازک ہے میرے سینے میں
نظر سے بھی جو گرے پاش پاش ہو جائے

نگاہ شوق ذرا دیکھ بھال کر اٹھے چھپا ہے راز جو دل میں نہ فاش ہو جائے

الہٰ مجھی سے ترک ملاقات کا گلہ — طرزِ ستم نئی ہے تغافل شعار آج
یہ آبگینے مجھ کو نہایت عزیز ہیں — اے خار دشت آبلہ کوئی نہ ٹوٹ جائے
نازک بہت ہے عشق و محبت کا آئینہ — سایہ پڑے بھی غیر کا اس پر تو ٹوٹ جائے

یہ اشعار سید صاحب کے معاصر شعرا میں سے کسی بھی اچھے شاعر کے لیے سرمایہ ناز ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر آخری شعر جس کے مجازی اور حقیقی دونوں پہلو بڑے پاکیزہ اور لطیف انداز میں پیش کیے گئے ہیں

سید سلیمان ایک خود آگاہ انسان تھے اور اقبال کی طرح عظمت انسانی کے قائل شاعری میں انسان کی بے مایگی شعرا کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ خدائے سخن میر اپنی بے چارگی کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں ؏

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، اور دن کو جوں توں شام کیا

لیکن سید صاحب اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ آسمان و زمین کو انسان کے لیے مسخر کیا گیا ہے، وہ اپنی ہستی کو اتنا بے اصل نہیں سمجھتے، وہ انسان کو تخلیق کا حاصل جانتے ہیں۔ فرماتے ہیں؛

میرے انوارِ تجلی سے فضا پُر نور ہے
میں جو ہوں مسرور تو سارا جہاں مسرور ہے

۱۹۴۲ء کے بعد سید سلیمان کی شاعری مشاہدہ حق کی گفتگو ہے، جب وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہو چکے تھے، بیعت سے پہلے ان کی دلی کیفیت کچھ ایسی تھی ؏

لب پہ ہے نام خدا دل میں ہے سودا اے صنم
مجھ کو اللہ کرے، دیکھتا اللہ نہ ہو

آنکھ میں توبہ کے آنسو دل میں اس بت کی ہوس
ہائے گنگا جل کو کیسے کوثر و زمزم کروں

اور ذہن میں کچھ اس قسم کے سوالات ابھر رہے تھے ؏

شکست رونق بت خانہ ہو نہیں سکتی — خلیل خود ہی اگر بت تراش ہو جائے

اسی عالم میں وہ مرشد کے آستانے پر پہنچ کر پکار اٹھے ؏

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے
جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے

اور پھر اس ساز پر عشق مجازی کا کوئی ترانہ نہیں چھیڑا گیا، اور آخری سانس تک مولانا

سید سلیمان کی شاعری کے جام سے معرفت کی مے چھلکتی رہی۔ ان کا عارفانہ کلام صوفیانہ شاعری کو اپنے دائرے میں لیے ہوئے ہے، صوفیانہ شاعری جس میں شیخ کا تصوّر، خانقاہ سے تعلق اور چشم ساقی کے لطیف اشارے اپنی پوری کیفیت اور گہری معنویت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ تصوف کو "برائے شعر گفتن خوب است"، کہہ کر شاعری کے ایک موضوع کی نشاندہی ضرور کی گئی ہے لیکن خود تصوف کے بارے میں اس سے کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔ ہماری صوفیانہ شاعری میں تصوف دو وسیلوں سے آیا ہے ایک فلسفیانہ نکتہ سنجی ہے، دوسرا حال وقال، فلسفیانہ یا حکیمانہ تصوف کی فضا کا تعلق دماغ سے ہے اور حال وقال کا دل سے۔ حالانکہ دماغ اور دل کی تقسیم خود شاعرانہ عمل ہے، لیکن اظہار مطالب کے لیے اس تقسیم کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے، حکیمانہ تصوّف کے لیے صاحب حال ہونا ضروری نہیں ہے لیکن صاحب حال کے لیے بیدار دل کے ساتھ بیدار ذہن کی بھی ضرورت ہے۔ ورنہ قدم کے غلط پڑ جانے کا ڈر ہے۔

سید سلیمان کی شاعری میں تصوّف بطور مسئلہ نہیں ہے۔ تصوف کی راہ سے قلب پر جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں ان کا بیان ہے اس لیے ان کی صوفیانہ شاعری میں معنی آفرینی یا نکتہ سنجی کے بجائے کیفیات قلبی اور واردات باطنی کو دیکھنا چاہیے اور بس۔ ان کے یہاں یہ کیفیات سیدھے سادے فطری انداز میں نظر آتی ہیں، جو عشق و محبت کا خاصّہ ہے۔ یوں بھی دل کا حال کہتے وقت فلسفہ وحکمت کی زبان گنگ ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ سید صاحب اپنی ساری متاع علم کے باوصف اس کے آگے کچھ نہیں کہہ پاتے ؎

جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے
ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں

اتنا ہی نہیں وہ اپنے سرمایۂ ہوش خرد کو بھی برق ایمن کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں، ؎

مرے ہوش وخرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں — لگادے برقِ ایمن آگ تو اس میرے حاصل کو

اور پھر وہ خود کو اس مقام پر پاتے ہیں جو ہر سالک کی منزل مقصود ہے، ؎

جہاں دیکھیں وہیں پائیں جہاں دیکھیں وہیں تو ہے — تجھے جو یاد کرتا ہے اسی کا ہمنشیں تو ہے
کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز — ہر رگِ جاں سازِ الا اللہ ہے
ہو کوئی آواز میرے کان میں — ہر صدا آوازِ الا اللہ ہے ؎

حوالے و حواشی ۔ (۱) مقدمہ شعلۂ طور، دیوان جگر مرادآبادی (۲) سید سلیمان ندوی کا مجموعۂ کلام "ارمغان سلیمان" بروقت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہ مقالہ لکھتے وقت صرف وہ اشعار پیش نظر رہے جو ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی کی قیمتی تصنیف "علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت اور ادبی خدمات" میں نقل ہوئے۔

اختر سعید خاں

دیگر احوال یہ ہے کہ

غالب کو شکایت تھی کہ شعروں کے انتخاب نے انھیں رسوا کر دیا لیکن یہ رسوائی خود انھوں نے مول لی تھی۔ ظاہر ہے کہ خود کردہ را علاج نیست۔ نہ شعروں کا انتخاب کرتے نہ رسوا ہوتے۔ لیکن مجھ غریب کی پریشانی یہ ہے کہ میں اپنا دیگر احوال خود نہیں سنا رہا ہوں، مجھے سنانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس وضاحت کے ساتھ کہ احوال کا تعلق نہ شاعری سے ہو نہ وکالت سے بلکہ دیگر سے ہو، اب کس سے کہوں کہ اس دیگر کے دائرے میں گفتنی اور ناگفتنی کے کیسے کیسے موڑ آتے ہیں۔ گفتنی کی حد تک تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن خیر سے میں اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں کہ ناگفتنی کی رکاب میں پاؤں رکھ کر رخشِ قلم کو دوڑا دوں اور سننے والوں سے ملامت کے بجائے سچ بولنے کی داد پالوں۔ ادھر اندیشہ یہ ہے کہ حدِ ادب کے اندر رہ کر اگر کچھ عرض کیا تو اس درویش کی داستان سے آپ لطف کیا اٹھائیں گے۔ مگر بات یہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے کہ آخر ریڈیو والوں نے جو فرمایش کی ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کی ہوگی۔ شاید اس کے پیچھے یہ خیال کار فرما ہے کہ ہمارے سماج میں شاعر اور وکیل خاص نمونوں کے کردار ہیں اور یہ شخص جس سے احوال پوچھا جا رہا ہے دونوں کرداروں کا رول ادا کر رہا ہے۔ کیوں نہ ایک تیر سے دونوں کو شکار کیا جائے اور خود اسی سے پوچھا جائے کہ آیا خلقِ خدا جو کچھ غائبانہ اور برملا کہتی ہے تو ایسا ہی ہے یا اس سے ہٹ کر بھی تیری زندگی ہے۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ شاعروں کے بارے میں عام خیال ہے کہ یہ خانہ اور اہلِ خانہ دونوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ کھانے سے کم پینے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ لباس میں گریباں کا چاک انھیں سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ انھیں گردشِ شام و سحر میں اگر کچھ پسند ہے تو روزِ ابر اور شبِ ماہتاب۔ تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے ان کا وظیفۂ حیات ہوتا ہے۔ ہاں منہ کا مزہ بدلنے کے لیے کبھی کبھی "اور بھی دکھ ہے زمانے میں محبت کے سوا" کا راگ بھی الاپ لیتے ہیں۔

کچھ باتیں وکیلوں کے لیے بھی مشہور ہیں جیسے ان کے ہاتھ اپنی جیب کے بجائے

موکّل کی جیب میں ہوتے ہیں۔ یہ پرائے غموں کا بیوپار کرتے ہیں لیکن اس سودے میں انھیں کبھی گھاٹا نہیں ہوتا۔ یہ مجرموں کے مددگار ہوتے ہوئے بھی سوسائٹی میں عزت دار کہے جاتے ہیں۔ ان کی شادی کا رشتہ طے کرتے وقت لڑکی والے یہ نہیں پوچھتے کہ لڑکے کی آمدنی کیا ہے۔ یہ بیوی سے زیادہ موکّل کے وفادار ہوتے ہیں اور جو کچھ کہا جاتا ہے میں کون جو آپ کو یاد دلاؤں۔ غرض ہزار منہ ہیں ہزار باتیں۔

سچ پوچھیے تو صاحب ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ سب گردش شام وسحر کے اسیر ہیں۔ میں نے اس شعر کا دوسرا مصرع عمداً نہیں پڑھا ہے کیونکہ اب وہ زمانے کے حالات سے میل نہیں کھاتا۔ میرا مطلب ہے کہ آج کل زلفوں کو کچھ اس انداز سے تراشا جاتا ہے کہ ان کی لمبائی کسی کو اسیر کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ آج کی آزاد سوسائٹی میں کوئی کسی کا اسیر ہو کر رہنا نہیں چاہتا۔ وہ بات مومن خاں کے زمانے کی تھی جب موصوف کو دعوا تھا کہ میں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر۔ ہم نہ جانیں صید کیا صیاد کیا۔ تو میں کیوں آپ کو میر صاحب کی طرف سے بدگمان کروں جن کا خیال تھا کہ

اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا جس سے نہ میرا کچھ بنتا نہ میر صاحب کا بگڑتا۔ عرض یہ کرنے جا رہا تھا کہ اس گردش شام وسحر میں نہ آپ کا حال مجھ سے جدا ہے نہ میرا احوال آپ سے نہ شاعر و وکیل کسی جداگانہ مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ ناچیز اپنی جملہ کمزوریوں کے باوصف نہ کسی کہانی کا ہیرو بن سکا نہ ولن۔ نہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دے سکا جو آپ کے گوش گزار کیا جا سکے۔

مجھ سے پوچھیے تو یہ دور کچھ کہنے سننے کا ہے بھی نہیں۔ صرف دیکھنے اور گزر جانے کا ہے۔ ہمارے شہر میں ایک بزرگ رہا کرتے تھے۔ وضع قطع سے مرد معقول، چہرے پر داڑھی متانت اور فضیلت کی قسم کھاتی تھی۔ لباس شرفا کا، سڑک کے کنارے کنارے سر جھکائے چلتے۔ کسی نے سلام کیا تو آہستہ سے وعلیکم السلام کہہ دیا اور اپنی راہ ہو لیے لیکن اگر کسی نے سلام کے بعد خیریت پوچھ لی تو بزرگوار ایسی بے نقط سناتے کہ خیریت پوچھنے والا بغلیں جھانکنے لگتا۔ رفتہ رفتہ خیریت ان کی چڑ ہو گئی اور لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ اب جدھر سے گزرتے دادا خیریت کے نعرے بلند ہوتے اور دادا کی صلواتیں۔ ایک دن موقع پا کر ہم نے عرض کیا، داداجان کی امان پاؤں تو ایک بات پوچھوں۔ دادا نے ایک آنکھ سے ہمیں دیکھا اور دوسری سے اپنے مونڈے کو، پھر دونوں کی طرف سے مطمئن ہو کر فرمایا پوچھ کیا پوچھنا ہے۔ ہم نے عرض کیا دادا اگر کوئی آپ کی خیریت دریافت کرتا ہے تو آپ خفا کیوں ہو جاتے ہیں۔ دادا نہ جانے اس وقت کون سے عالم میں تھے کہ نہ ان کا ڈنڈا جنبش میں آیا نہ زبان بلکہ چہرہ

یاس والم کی تصویر بن گیا۔ بڑے مشفقانہ انداز میں گویا ہوئے۔ ابھی صاحبزادے ہو۔
تم کیا جانو خیریت کس چڑیا کا نام ہے۔ کیا تم نے اسے کسی گھر میں دیکھا ہے۔ اچھا
یہ بتاؤ جو چیز مجھے کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی اس کا نام لے لے کر مجھے کیوں ستایا جاتا
ہے۔ جب تم مجھے جان بوجھ کر چھیڑو تو مجھے کہاں تک غصّہ نہ آئے۔

غالب کے شعر بھی کب کب اور کہاں کہاں منکشف ہوتے ہیں، شاید ایسے ہی
کسی عالم میں مرحوم نے کہا تھا۔

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

آمدم برسر مطلب کہ اپنا حال عبارت ہے چند عقیدوں اور ایک خاص تہذیب کی
پاسداری سے عقیدوں کے چراغ ایک ایک کر کے گل ہوتے جا رہے ہیں اور تہذیبی
قدریں دیکھتے ہی دیکھتے خواب و خیال ہونے لگی ہیں۔ نہ بجھتے ہوئے چراغوں سے
ایسا کوئی چراغ جلایا جا رہا ہے جس سے دل و نگاہ میں روشنی ہو جائے نہ مٹتی ہوئی
تہذیب کوئی ایسا گھر چھوڑے جا رہی ہے جہاں پناہ لی جا سکے۔

روحانی شناخت کا بکھراو۔ رشتوں کی شکست و ریخت اور تہذیبوں کے
تصادم کی آندھیاں ہیں اور میں خزاں دیدہ پتے کی طرح ایک جھولتی ہوئی شاخ پہ لرزاں
ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ کیا زندگی اتنی ہی بے معنی ہے جتنا اسے بنایا جا رہا ہے۔ آج
تک زندگی میں جتنی معنویت پیدا کی گئی تھی کیا وہ سب بے کار تھی۔ کیا سورج
کی شعاعوں کو اسیر کرنے والا انسان اپنی اندھیری رات کو کبھی سحر نہ کر سکے گا۔ فطرت
کو تسخیر کرنے والی انسانی طاقت اپنی بربادی کا سامان خود کیوں مہیا کر رہی ہے یہ
گھنی آبادیوں میں جنم لینے والا آدمی اس درجہ تنہائی کا شکار کیوں ہے۔ یہ امن و محبت
کی گود میں پالی ہوئی دنیا عدم تحفظ کے احساس میں کیوں مبتلا ہے۔ یہ صنعتی نظام
انسان کی راحت کے لیے ہے یا اس کی نیندیں اڑا دینے کے لیے۔ یہ مذہب، رنگ
نسل اور خون کے سوداگر زندگی کو کس سمت ڈھکیل رہے ہیں۔ یہ مذہبی منافرت
پھیلانے والے کس مذہب کے ماننے والے ہیں۔ سیاسی رہنما، مذہبی پیشوا،
اصلاحات کے نقیب، انقلاب کے علمبردار، سب اپنے اپنے مسائل میں گھرے
ہوئے ہیں، سب کا دعوا ہے کہ انھوں نے انسان کے دکھ، درد کا مداوا ڈھونڈ
لیا ہے مگر کوئی دعوا ایسا نہیں جس کی حیثیت افواہ سے زیادہ ہو۔

صدیوں کے تجربے نے انسان کو جینے کا سلیقہ سکھایا تھا اس سلیقہ کو آگے
چل کر تہذیب کا نام دیا۔ تہذیب نے مذہب، زبان، آرٹ اور دوسرے فنون
لطیفہ کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ یہ وابستگی شوق کی بنا ہیں نہیں تھیں۔ زندگی کی
معنویت کی تلاش تھی۔ کیونکہ زندگی صرف اس کا نام نہیں کہ بی اے کیا نوکر ہوئے

پینشن ملی اور مر گئے۔

میرا احوال اس لیے پریشان نہیں ہے کہ نئے نظام کا ماضی کی اقدار سے ٹکراو ہے۔ یہ تو تاریخ کا عمل ہے اور اس سے آنکھیں چرانا ممکن نہیں ہے۔ مجھے تو ماتم اس کا ہے کہ نئے نظام میں ان تہذیبی قدروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے جو زندگی کے رخسار کا غازہ ہیں۔ جن کے سائے میں امن و عافیت کے خواب پلتے تھے جن کی روشنی میں آرزو و جستجو کے معرکے سر ہوتے تھے۔ جن کا رشتہ ہونٹوں کی مسکراہٹ سے بھی تھا اور آنکھوں کے آنسوؤں سے بھی۔ جو شعر بھی تھیں اور نغمہ بھی، جو حسن کی ادا شناس بھی تھیں اور عشق کی راز دار بھی۔ ان کے بغیر زندگی کیسی بے روح، بے کیف اور بے سروپا معلوم ہوگی۔

ہوسکتا ہے کہ یہ احوال میرا اور مجھ جیسے چند اور لوگوں کا ہو، ہوسکتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس نوع کی تہذیب سے آشنا ہی نہ ہوں۔ اس لیے بہتر تو یہ تھا کہ میں اپنے احوال کے اس پہلو کو آپ کے سامنے رکھنے کے بجائے دیگر احوال کا رشتہ انشائے مادھورام سے جوڑ دیتا جس کے انداز بزرگوں کے زمانے سے کچھ اس طرح چلا آرہا ہے کہ "بحمد اللہ یہاں خیریت ہے اور خیریت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب۔ دیگر احوال یہ ہے کہ اس کے بعد جو چاہتا آپ سے عرض کرتا مگر یہ ہرگز نہ کہتا کہ باقی خیریت ہے۔

اختر ستان

ایک اشاریہ

ڈاکٹر سید حامد حسین

(الف) تحریرات اختر

شعری تخلیقات

مجموعہ غزلیات

(۱) "نگاہ" مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال۔ (۱۹۸۶) (۲) "انتخاب اشعار مع حالات زندگی" خدا بخش لائبریری پٹنہ۔ (زیر طبع) (۳) انتخاب کلیات میر مع کچھ انتخاب کے بارے میں" زیر طبع شاعر ماہنامہ

نظمیں (مجموعہ زیر ترتیب)

"کارواں" "امن کا نعرہ" "آئین" "خون کی قیمت" "چاند گرہن" "جمہوریہ ہند کے پہلے انتخاب کے بعد" "جمہوریہ ہند کی تیسری سالگرہ پر" "نئے انسانوں کا کورس" "لفظوں کا سفر" "کل سے آج تک" (نا تمام نظم) "غبار خاطر" "یاد جگر" "بہ یاد نہرو" "جنازہ ٹھہراؤ" (تاج بھوپالی کے انتقال پر) "نذر کوثر چاندپوری" "بہ حضور رسالت مآب ﷺ" "بہ حضور امام حسین رض" "بہ حضور خواجہ معین چشتی رح"
"در رسول پر"
"رت" (نظم معریٰ) "سحر ہونے تک" (نظم معریٰ)
"ٹیگورس" (گارڈنر) میں شامل ٹیگور کی نظموں کا غیر مقفیٰ ترجمہ) اور دیگر نظمیں

نثری تحریرات

مقالات، تبصرے، جائزے، خاکے، دیباچے

"اقبال کے قومی و وطنی نظریات" مشمولہ"

"بیا بمجلس اقبال" کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز۔ بھوپال۔ ۱۹۹۰ء
"شیش محل اور اقبال" "افکار" (کراچی)۔ ۱۹۹۲ء
"غالب نام آورم" ۱۹۶۹ء
"حیوان ظریف" (غالب پر ریڈیو فیچر)
"قدیم بھوپال کے مشاعرے" "الجبل" (بھوپال)
"بھوپال کا لسانی جائزہ" "ایاز" (بھوپال)۔ بھوپال نمبر
"اردو غزل کی ابتدا اور دوسری زبانوں میں اس کا داخلہ"
"سید سلیمان ندوی کا شعری آہنگ" مشمولہ "مطالعہ سلیمانی" مرتبہ مسعود الرحمٰن خاں
"فیض، افسون انتظار تمنا کہیں جسے" "ندیم" (بھوپال)۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۸۸ء
"مظفر حنفی، سخن کے آئینے میں" "انشا" (کلکتہ)۔ اپریل، مئی ۱۹۹۲ء
"اردو ادب میں ایک نئے اسلوب کا خالق: ملا رموزی" مشمولہ "مدھیہ پردیش میں اردو ادب کے پچیس سال"۔ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی۔ بھوپال۔ ۱۹۸۱ء
"میں اور میرا فن" "ندیم" (بھوپال) ۱۹ جولائی ۱۹۹۲ء
"یاد یار مہرباں" (ایم۔ عرفان کے متعلق) "ندیم" (بھوپال)۔ ۱۹۹۰ء
"جاں نثار اختر کے دو برس بھوپال میں" "فن اور شخصیت" (بمبئی) جاں نثار اختر نمبر مارچ ۷۶ ۱۹ء
"شاکر علی خاں" کتابچہ مطبوعہ کمیونسٹ پارٹی بھوپال)
"میرے تایا ابا" (شریف محمد خاں فکری) "ندیم" (بھوپال)۔ ۱۹۷۲ء
"حکیم قمر الحسن" "ندیم" (بھوپال)۔ قمر الحسن نمبر۔ ۲۶ نومبر ۱۹۸۱ء
"بابو میاں" (عبد الکریم صاحب سابق چیرمین میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ جج اور کاؤنسل (بھوپال)
"ذاکر حسین کی یاد میں" (ریڈیو تقریر)
"اعتراف" (سووینر مجروح سلطانپوری)
"تخلص بھوپالی" "شگوفہ" (حیدرآباد) تخلص نمبر۔
"عشرت قادری" "فکر و آگہی" (نئی دہلی)
ایک مطالعہ "زیر لب" از صفیہ اختر "شاہراہ" (دہلی) ۱۹۵۳ء
ایک نظر "حرف آشنا" از صفیہ اختر۔ "افکار" (بھوپال)
تبصرہ "سحر ہونے تک" از آغا جانی کشمیری
مقدمہ "لمحات سہا" مجموعہ کلام سہا مجددی مطبوعہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال ۱۹۸۵ء
"تاج میرے لیے" پیش لفظ "خیمۂ گل" از محمد علی تاج۔ ۱۹۵۶ء
مقدمہ "سرو چراغاں" از مقصود عرفان
پیش لفظ "تار پیرہن" از وفا صدیقی۔

پیش لفظ مجموعہ کلام نور محمد یاسؔ۔ ۱۹۸۴ء
پیش لفظ مجموعۂ کلام سازؔ سرونجوی۔
پیش لفظ مجموعۂ کلام کیفؔ بھوپالی۔ ۱۹۹۳ء
پیش لفظ "تقدیرِ حنا" از عرشی بھوپالی۔ ۱۹۹۳ء
پیش لفظ مجموعۂ کلام ملکہ نسیم - ۱۹۹۳ء

انشائیے، ریڈیو تقاریر اور ریڈیو فیچر (جو دستیاب ہوسکے)

"خاموش خدمت گار"
"ایک مشکل کام رنج و الم میں مسکرانا" (۱۹۷۳ء)
"ہر بات میں توبہ کرنے والوں سے"
"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت"
"وہ دیوان خانے اور یہ ڈرائنگ روم"
"مشکل میں جان ہے گھر کے وکیل سے" (۱۹۷۳ء)
"جب جج صاحب بھی ہنس پڑے"
"آج کی آواز"
"شاعر" (طنزیہ)
"دیگر احوال یہ ہے کہ ۔۔۔" (۱۹۸۹ء)
"مقدمہ باز"
"اردو شاعری میں موسم سرما"

ب) جائزۂ اختر

فیروزہ یاسمین: "اختر سعید خاں، شخصیت و فن"۔ مقالہ برائے ایم اے سال آخر (اردو) برکت اللہ یونی ورسٹی بھوپال ۱۹۸۶ء۔
گوشہ اختر سعید خاں۔ "شاعر" (بمبئی) شمارہ ۵ نمبر ۱۲۔ ۱۹۸۴ء
۱۔ خورشید سکندر بخت: "سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود"
۲۔ عبدالقوی دسنوی: "اختر سعید خاں غزل اور نظم کے محترم شاعر"
۳۔ ایم۔ اے شاد: "ایک شخصیت ایک مثلث"
۴۔ اقبال مسعود: "اختر سعید خاں سے کچھ سوال اور ان کے جواب۔
سردار جعفری: "دیباچہ" برائے "نگاہ" (مجموعہ غزلیاتِ اختر سعید خاں)
مظفر حنفی: تبصرہ "نگاہ"، "کتاب نما"، (نئی دہلی)۔ جولائی ۱۹۸۶ء
راج بہادر گوڑ: "اختر سعید خاں: اسیر زلف شب مالوہ" "حیات"، (نئی دہلی) یکم جون ۱۹۸۶ء

شفیعہ قادری: تبصرہ "نگاہ"، "جامعہ عثمانیہ" (حیدرآباد)، مشمولہ "تعارف" ۱۹۸۶ء
ظفر صہبائی: "اختر سعید خاں کی شاعری ہماری وراثت"، "بھوپال ٹائمز"، (بھوپال)، ۳، ستمبر ۱۹۸۹ء
شمع زیدی: "رسن و دار اور فراز دار کے الفاظ کی روایت بہت پرانی ہے" (ہندستان کے ممتاز شاعر اختر سعید خاں سے ملاقات)۔ روزنامہ "حریت" (کراچی) ۱۸ جون ۱۹۸۵ء
وقار حسین: "حضرت اختر سعید خاں اختر"، "مدھیہ پردیش سندیش"، (بھوپال)
یوسف ناظم: تبصرہ نگار آجکل ماہنامہ
قمر ساحری " ماہنامہ افکار کراچی